اکیسویں صدی میں

اسلام، مسلمان اور تحریک اسلامی

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی

فہرست

پیش لفظ ۵

- اکیسویں صدی میں اسلام، مسلمان اور تحریک اسلامی ۷
- تشدد، اسلام اور تحریک اسلامی ۲۷
- اسلامی ترجیحات ۵۳
- اسلامی نظام فکر کا متحرک مزاج ۷۹
- جہاد، اجتہاد اور مجاہدۂ نفس ۸۷
- مذہبی روایات کے جوہر کو سمجھنے کی ضرورت اور اہمیت ۱۰۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

'كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ' وقت کی ہر کروٹ نئے حالات اور نئے مسائل سامنے لاتی ہے۔ جب صدی بدلتی ہے تو تبدیلیوں کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں اہل فکر و دانش نے ان نئے چیلنجوں کو موضوع بحث بنایا ہے جن سے اسلام اور مسلمانوں کو سامنا ہے۔ تحریک اسلامی جس کا ہدف انسانیت عامّہ تک خدا کا پیغام پہنچانا، اور اِس مشن کی انجام دہی کے لیے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر تیار کرنا ہے، اس غور و فکر میں پیش پیش رہی ہے۔

اس مجموعہ میں شامل مقالات اِسی غور و فکر کا ثمرہ ہیں۔ ان مقالات کے ذریعہ چند اہم باتوں پر زور دیا گیا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ نئے حالات میں سوچنے کا کام صرف خواص اور علماء تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ اس میں سب کی حصہ داری ضروری ہے۔ نئے حالات میں اسلام کے انسانی مشن کی انجام دہی اور اس کے لیے تیاری کس طرح کی جائے، اس سوال کا جواب صرف کتابی اجتہاد سے نہیں مل سکتا بلکہ اس کے لیے اُس میدانی اجتہاد کی ضرورت ہے جسے مختلف ملکوں اور علاقوں میں اسلامی دعوت و اصلاح کا کام کرنے والے ہی انجام دے سکتے ہیں۔

دوسری اہم بات ترجیحات کا مسئلہ ہے۔ یوں تو سارے اسلامی کام اہم ہیں مگر ہندوستانی مسلمانوں کا حال دیکھتے ہوئے بعض کام فوری اہمیت کے حامل ہیں، ان کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ناخواندگی اور جہالت مرض اور کمزوری اور غربت و افلاس دور کیے بغیر ہندوستانی مسلمانوں سے اسلام کی عملی نمائندگی اور اس کی سچائیوں کو سب تک پہنچانے کے کام کی بھرپور توانائی کے ساتھ انجام دہی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ جو لوگ کسی ایجابی مقصد کے لیے کوشاں ہوں ان کے لیے

صبر وضبط سے کام لینا اور حکمت کے ساتھ آگے بڑھنا بہت ضروری ہے۔ آج ماحول کی طرف سے مسلمانوں کو تشدّد پر آمادہ کرنے والی ہزار باتیں ہوں گی مگر حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے جسمانی دفاع کے علاوہ کسی اور کام کے لیے طاقت کو ذریعہ نہ سمجھیں۔

زمانہ میں تبدیلی کی رفتار ہمارے غور وفکر کی رفتار سے زیادہ تیز ہے۔ بعید نہیں کہ ان مقالات کے پڑھنے والوں کو بعض باتیں ''پرانی'' معلوم ہوں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ہم باتوں سے آگے بڑھ کر عمل کے میدان میں کہاں تک پہنچے!

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ط

محمد نجات اللہ صدیقی

۲۷ / جون ۲۰۰۵

الحمیرا۔ مزمّل منزل۔ دودھ پور۔ علی گڈھ

اکیسویں صدی میں

اسلام، مسلمان اور تحریک اسلامی

ہمارے موضوع ''اکیسویں صدی میں اسلام، مسلمان اور تحریک اسلامی'' کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تھوڑا وقت اس پر صرف کریں کہ بیسویں اور اکیسویں صدی میں فرق کیا ہے؟ ظاہر ہے، ہر فرق کا اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں آغاز اس فرق سے کرتا ہوں جو بہت نمایاں ہے، اور تمام مطالعہ کرنے والوں کے خیال میں اس نے جوہری طریقے پر انسانی سماج پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔

مواصلاتی انقلاب

یہ وہ فرق ہے جو مواصلات (Telecommunication) کے میدان میں گزشتہ دس پندرہ سالوں میں بہت تیزی سے ہونے والی تبدیلیوں سے آیا ہے۔ آپ دہلی میں رہتے ہیں، آپ نے دیکھا کہ ہندوستان کے تمام شہروں میں آج سے پندرہ بیس سال پہلے آپس میں ٹیلی فون پر بات کرنا یا خاص طور پر ملک کے باہر سے گفتگو کرنا خاصا زحمت طلب کام تھا۔ جب سے موبائل فون کا رواج ہوا ہے، تب سے یہ زحمتیں کافی کم ہوگئیں ہیں۔ دور کے دیہاتوں سے بھی آسانی سے ربط ہو جاتا ہے۔ یہ بات صرف ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں تک محدود نہیں ہے۔ ہم سے زیادہ غریب ملکوں میں بھی کم سے کم یہ سہولت کافی دور دور تک پہنچ گئی ہے۔ ساؤتھ افریقہ کے دور دراز علاقوں اور بنگلہ دیش کے گاؤں میں ایک سادہ سا طریقہ یہ ہے کہ کسی نے قرضہ لے کر

ایک موبائل فون خرید لیا اور جیسا کہ میں نے ایک خاتون کے بارے میں پڑھا ہے کہ وہ اس کو لے کر پورے گاؤں کا دورہ کرتی ہیں۔ کسی کو فون کرنا ہے، فون کرا دیا اور وہیں پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے چارجز کیا ہوتے ہیں۔ وہیں پر ادائی ہو جاتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ کسی کا بچہ بیمار ہوا، ڈاکٹر سے وقت لینا ہوا یا کوئی اور معلومات فراہم کرنی ہو، بلکہ اس کا اثر تجارت اور بہت سی چیزوں پر بھی پڑ رہا ہے۔ بہت معمولی چیز کو لے لیجیے کہ آپ کو منڈی کا بھاؤ کوئی غلط بتا کر دھوکہ دے سکتا تھا، آپ صحیح معلوم کرنا چاہیں تو مشقت طلب چیز تھی، اب اسے آسانی سے فون کے ذریعہ معلوم کر لیتے ہیں اور اس سے آپ کی کاروباری زندگی پر نمایاں اثر پڑتا ہے۔ صحت، تعلیم، کاروباری زندگی، اور ان کے علاوہ بہت سے دائرے ہیں جیسے تبلیغ و اشاعت، کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جو فون کے ذریعے سستے اور تیز اتصال سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ 'سستا' میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہمارے یہاں بھی ٹیلی فون کے ریٹس کم ہو رہے ہیں۔ یہ عمل ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ ان باتوں سے مقصد یہ ہے کہ رابطہ سہل، تیز اور سستا ہو گیا ہے۔ یہ بات صرف ٹیلی فون ہی تک محدود نہیں ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ پچھلے تیس سالوں میں کمپیوٹر اور ٹیلی ویژن کا رواج بڑھا۔ دونوں نے دور کی آواز، اور دور کی تصویر اور دور کی جھلک، گاؤں گاؤں پہنچا دی۔ اس کا اثر بھی زندگی پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ آپ کو وہ تصویر یاد ہوگی، آٹھ سال یا گیارہ سال کے بچے کی، فلسطین میں جس کا باپ اس کو بچاتے ہوئے اسرائیلیوں کی گولیوں کا شکار ہو گیا تھا۔ اس میں وہ بچہ بھی شہید ہوا تھا۔ اس کی تصویر فرانس کے کیمرہ والے نے لے لی تھی، جس نے پوری دنیا پر اسرائیل کے خلاف جتنا اثر ڈالا ہے، اتنا بہت سی تصویروں نے نہیں ڈالا۔ اسی طریقے سے بعض مشہور تصویریں پچھلے پچیس سال کی رہی ہیں جو صرف اس لیے بہت عام ہو گئیں کہ انھوں نے بہت گہرا اثر ڈالا۔ ایک منظر آپ کو شاید یاد ہو کہ ایک سیاہ فام آدمی جس کو لاس اینجلز میں پولس نے بے دردی سے بلا وجہ مارا اور اتنا مارا کہ وہ مر گیا اور اس کی لاش سڑکوں پر کھینچی، کوئی آدمی جو اپنے مکان کی تیسری منزل پر ایک ویڈیو کیمرہ لیے ہوئے تھا، اس نے پورا منظر ویڈیو میں محفوظ کر لیا۔ پھر وہ پوری دنیا میں عام ہو گیا۔ لاس اینجلز پولس کو ان افسران کے خلاف کارروائی کرنی پڑی؛ اور کوئی شکل ایسی نہیں بنی کہ وہ سفید فام افسران یا جس رنگ کے بھی وہ رہے ہوں، اس پر پردہ ڈال سکیں۔

ٹی.وی.کی بہت سے خرابیاں ہیں چھری کی بھی بہت سی خرابیاں ہیں۔چھری سے پھل بھی کٹتا ہے اور چھری سے گردن بھی کٹتی ہے۔اسی طرح سارے وسائل اور ذرائع میں خرابیاں ہوتی ہیں لیکن بہر حال، ذریعہ کا موثر ہونا ایک اہم بات ہے۔اس کے دور رس اثرات انسانی زندگی پر پڑتے ہیں۔چناں چہ ٹیلی فون کی طرح ٹی.وی.کا بھی بہت اثر پڑا ہے۔ہم جانتے ہیں کہ اس سے فاصلاتی تعلیم کا بھی کام لیا جارہا ہے۔کمپیوٹر کا انسانی زندگی پر بہت اثر پڑا ہے لیکن جب سے انٹرنیٹ کا استعمال ہوا ہے، تب سے دنیا بالکل بدل گئی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹی.وی.کے برعکس انٹرنیٹ ایک، دوطرفہ مواصلت کا ذریعہ ہے۔آپ اس کے ذریعہ صرف سن اور دیکھ نہیں سکتے بلکہ آپ سنا اور دکھا بھی سکتے ہیں۔ایک آدمی اپنے کمرے میں بیٹھ کر یا کمرہ بند کر کے دنیا کے کسی حصے میں بھی اپنی بات پہنچا سکتا ہے اور کسی حصے کی بات کو دیکھ سکتا ہے۔اب یہ تو اس آدمی پر منحصر ہے کہ وہ فحش تصویریں دیکھتا ہے یا قرآن کی تلاوت سنتا ہے یا اس کا ترجمہ پڑھتا ہے یا سائنس کی معلومات حاصل کرتا ہے! اس پر کنٹرول، مشین تو نہیں کر سکتی کہ انسان کے لیے ٹکنالوجی جو مواقع پیدا کرتی ہے، ان مواقع کو انسان دوسرے انسانوں کو مارنے اور ان کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے یا سماج کی بہبود کے فروغ کے لیے استعمال کرتا ہے۔اور یہ آزادیٔ انتخاب ہمیشہ انسانوں کے لیے رہے گی؛ اور یہی آزادیٔ انتخاب وہ چیز ہے جس کا نام زندگی ہے:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط

(الملک:۲)

''جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تا کہ لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔''

انسان کو دو پاؤں اور دو ہاتھ دیے گئے۔ہابیل اور قابیل کی کہانی سے آج تک یہ بات معلوم ہے کہ یہ دو ہاتھ، بھائی کے قتل کے لیے بھی استعمال ہو سکتے ہیں، اور یہی دو ہاتھ اپنے بھائی کو آگے بڑھانے کے لیے بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔یہ تو خیر وشر کی آماجگاہ ہے۔اور یہی انسان کی انتہا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ انسانی میں پہلی بار انٹرنیٹ ایک ایسی چیز ایجاد ہوئی جو تقریباً بنا لاگت کے دوسروں سے ربط ممکن بناتی ہے۔اگر پرسنل کمپیوٹر (PC) کسی کے پاس ہے تو انٹرنیٹ ایکسس کیبل کے ذریعہ یا ٹیلی فون کی لائن کے ذریعہ ممکن ہے۔وہ اپنی ویب سائٹ

بنا سکتا ہے۔ جیسا کہ ویب سائٹ جماعت کی ہے اور S.I.O. کی ہے، ہزار ہا ہزار اسلام کی ویب سائٹس ہیں۔ آپ میں سے اکثر کو معلوم ہوگا کہ فقہ کی سیکڑوں کتابیں، حدیث کی تمام کتابیں، اہم تفاسیر۔ سب انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں جنھیں آپ مفت پڑھ سکتے ہیں، ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں، چھاپ سکتے ہیں۔ مباحثے ہر موضوع پر ہو رہے ہیں۔ رویت ہلال سے لے کر اور ہر طرح کے بہت سے موضوعات ہیں، جن پر مسلمانوں کے درمیان بحث انٹرنیٹ پر جاری ہے۔ اس کے علاوہ مسئلہ کشمیر اور فلسطین۔ ہر مسئلے پر الگ الگ بحث و مذاکرہ کی سائٹس موجود ہیں۔ یہ فری فار آل (Free for All) چیزیں ہیں، یہ اس سے پہلے موجود نہیں تھیں۔ پہلے کی دنیا اس سے بہت مختلف تھی۔ دور سے رابطہ قائم کرنے میں کافی لاگت آتی تھی اور دور سے ربط قائم کرنے والے اکثر نظر نہیں آیا کرتے تھے۔ اب اتنی پرائیویسی ہوگئی ہے کہ آپ کو کوئی جان نہ سکے اور آپ دور تک پہنچ جائیں۔ یہ انٹرنیٹ کی بدولت ہی ممکن ہے۔

بیسویں اور اکیسویں صدی میں ہونے والے بڑے فرقوں میں سے ایک فرق یہ ہے کہ ہر فرد کی پہنچ دنیا کے کسی بھی حصے تک ہو جاتی ہے۔ پہلے یہ تھا کہ آپ ملک کے باہر کسی سے رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو عام طور پر ننانوے فیصد حالات میں ربط آپ کو حکومت کے ذریعے کرنا ہوتا تھا۔ پیسہ باہر بھیجنا ہو تو، پیسہ باہر سے منگوانا ہو تو، کسی رسالے کا خریدار بننا ہو تو، ایک کتاب باہر بھیجنی ہو تو، سفر کرنا ہو تو، کسی کو بلانا ہو تو، کسی بھی چیز کا تصور کر لیجیے، کسی ایک ملک کا رہنے والا ایک فرد دوسرے ملک کے رہنے والے کسی فرد سے ربط و تعامل کے لیے اتھارٹی کی اجازت اور ذریعے کا محتاج تھا۔ سب سے بڑی تبدیلی جو انسانی زندگی میں گزشتہ دس برسوں میں ہوئی، وہ یہ ہے کہ یہ حکومت کا ذریعہ ختم ہو گیا۔ اب کسی فرد کو کسی دوسرے فرد سے ربط کے لیے نہ حکومت کی اجازت لینی ضروری ہے، اور نہ حکومت کو کوئی اطلاع دینی ضروری ہے۔ حتی کہ اب حکومت کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ کسی سے وہ ربط کر رہا ہے کہ نہیں۔ وہ کیا کہہ رہا ہے، کیا نہیں کہہ رہا ہے۔ یہ اس انٹرنیٹ کے ذریعے ممکن ہوا ہے۔ اس وسیلے کی نگہ داشت دشوار ہے، اس پر بڑی لاگت آتی ہے۔ چناں چہ حکومتوں کے لیے اس پر کنٹرول کرنا بہت مشکل ہے کہ ان کے شہری، بیرون ملک رابطہ نہ قائم کر سکیں۔ آپ کے پاس اگر کریڈٹ کارڈ ہے تو آپ دنیا کی کسی کتاب کا Amazon.com کے ذریعہ آڈر دے سکتے ہیں۔ وہ ڈاک کے ذریعہ یا رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے

یا کوریر کے ذریعے آپ تک پہنچ جائے گی۔ اگر آپ کوئی خاص مہارت رکھتے ہیں، کوئی نسخہ رکھتے ہیں یا کوئی مشورہ رکھتے ہیں، جسے آپ فروخت کرنا چاہتے ہیں تو آپ اپنی ویب سائٹ پر اس کا اعلان کر سکتے ہیں، دوسرے آپ کو ادائیگی کر سکتے ہیں۔ آپ سے جو مشورہ اور جو خدمت حاصل کرنا چاہیں، کر سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، ہمارے ملک میں ابھی اس طریقے کو عام ہونے میں وقت لگے لیکن ہم اس کی طرف بڑھ ضرور رہے ہیں۔

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ سعودی عرب کے اندر انٹرنیٹ ایکسس عوام تک پہنچانے کے لیے حکومتی سطح پر مذاکرات ہوئے اور اس پر غور وفکر میں دو ڈھائی سال صرف ہوئے لیکن جب بالآخر انھوں نے ۱۹۹۸ء کے آخر میں اس کی اجازت دی اور سال بھر کے بعد جو اعداد وشمار آئے تو خریداروں کی فہرست میں عورتیں زیادہ تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پندرہ بیس سالوں میں عورتوں کے اندر تعلیم بہت تیزی سے پھیلی، لیکن ان کا باہری دنیا کے ساتھ ربط وتعامل بہت محدود تھا، خود آپس میں ربط بھی دشوار تھا۔ حالاں کہ وہاں کافی تعداد عورتوں کی ایسی تھی جو تجارتی مزاج رکھتی تھیں۔ کوئی ڈیزائن کی ماہر تھی، کوئی فیشن کی ماہر، کوئی کسی اور چیز کی۔ کوئی اقتصادی مشورے دے سکتی تھی، تو ان کو پہلی بار انٹرنیٹ نے یہ موقع فراہم کیا کہ وہ بغیر کسی واسطے کے گھر بیٹھے باہر سے بزنس روابط کر سکتی ہیں۔ جو لوگ اس میں دل چسپی رکھتے ہیں، وہ مزید معلومات حاصل کر سکتے ہیں، لیکن میں صرف اس پر زور دینا چاہتا ہوں کہ یہ آزادی اور یہ سہولت، دوررس اثرات کی حامل ہے۔ ایک اور خوبی انٹرنیٹ کے وسیلہ ربط وترسیل میں یہ ہے کہ جب تک بہت زیادہ لاگت برداشت کر کے کوئی کسی کے پیچھے نہ پڑ جائے، یہ ذریعہ تفریق وامتیاز سے مبرّا ہے۔ یعنی ربط کرنے والے کا نام، ذات، مذہب، وہ کہاں سے بات کر رہا ہے، مرد ہے کہ عورت، بچہ ہے یا بڑا، کالا ہے یا گورا، اردو بولتا ہے یا ہندی، کچھ پتا نہیں چل سکتا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی بنیاد پر اب تک افراد سے تفریق وامتیاز برتا جاتا رہا ہے۔ ایک آدمی نے اپنی سند بھیجی۔ اس کے سب کاغذات اچھے پائے گئے، اتھارٹیز بہت مطمئن ہوئیں مگر جب وہ شخص خود سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اس کا رنگ کالا ہے، آتے ہی انٹرویو بورڈ نے فیصلہ کر دیا کہ اسے نہیں لینا ہے۔ ایک آدمی ہے، اس کا نام معلوم نہیں۔ اس کی باتوں اور اس کے جوابات سے بہت متاثر ہوئے، اس کی لیاقت کا بہت اثر ہوا لیکن جب یہ معلوم ہوگیا کہ ہندو ہے یا عیسائی یا مسلمان یا فلاں ذات کا ہے تو

طے کرلیا گیا کہ نہیں لیا جائے گا۔ انٹرنیٹ ہی ایسا غیر جانب دار ذریعہ ہے ربط وتعامل کا، جو اس امتیازی سلوک کی بنیادوں کو ناقابل التفات قرار دیتا ہے۔ اس پر میں بہت زیادہ وقت صرف نہیں کرنا چاہتا ہوں؛ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں بڑی تبدیلی آئی ہے، اور اس کا اثر انسانی زندگی پر بہت گہرا پڑا ہے، اور آنے والے حالات میں ہم اس کے اثر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

مواصلاتی انقلاب نے دنیا کو ایک کردیا تو دنیا کے پچھڑے ہوئے علاقوں کے عوام میں نئی امنگیں بیدار ہوئیں۔ غریب ملکوں کے عوام یہ پوچھنے لگے کہ زندگی گزارنے کی جو سہولتیں ترقی یافتہ ممالک میں پائی جاتی ہیں، وہ ان کو کب اور کیسے میسر ہوں گی۔ بادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور فوجی حکمرانوں اور تاحیات صدر بن جانے والوں نے اپنے عوام کو اظہار خیال اور اجتماع کی جن آزادیوں سے محروم کر رکھا ہے، اب ان کا مطالبہ کیا جانے لگا ہے۔ جہاں ذات پات، رنگ و نسل اور عقیدہ ومسلک کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تفریق برتی جاتی ہے، وہاں کے لوگ دیکھ رہے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک میں صلاحیت، کردار اور کارکردگی کی بنیاد پر آگے بڑھنے کے مواقع سب کو حاصل ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہو۔ مختصر یہ کہ نقل وحمل اور مواصلات میں انقلاب نے نئے خواب دکھائے، نئے حوصلے بیدار کیے اور انسانی سماج کی تشکیل نو کے لیے سازگار حالات پیدا کیے۔ ماحول بالکل بدل گیا ہے۔

نئے رجحانات

دنیا بقول شخصے، پہلے دوستوں اور دشمنوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک بلاک کے لوگ دوست تھے اور دوسرے بلاک کے لوگ دشمن۔ اب نہ دوست رہے، نہ دشمن! اب سب ایک دوسرے کے حریف، مسابقت کرنے والے (Competitor) ہوکر رہ گئے ہیں۔ ایک دوسرے سے مسابقت میں لوگوں کو زیادہ دلچسپی ہوگئی۔ اب آپ مسابقت کرنا چاہیں گے بحیثیت ایک ملک کے تو مسابقت کے لیے ضروری ہوگا کہ ملک کے سارے لوگ پیداواری عمل میں دلچسپی کے ساتھ حصہ لیں؛ اور دلچسپی آدمی کو اس وقت ہوتی ہے جب اسے اپنی محنت کا پھل واپس ملنے کی امید ہوتی ہے۔ جب محنت کا پھل دوسروں کو ملتا ہے تو کوئی دل لگا کر کام نہیں کرتا ہے۔ تو جو ممالک اس

میں شامل ہیں، ہندوستان، جنوبی افریقہ اور ایشیا کے لوگ۔ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ ہم باہر کی امداد لے نہیں سکتے اور اندر کی پیداوار بڑھانی ہے۔ اپنے اندر کی پیداوار بڑھانے کے لیے لوگ اپنی بچت پیش کرنے، سرمایہ کاری کرنے پر اس وقت تیار ہوں گے جب انھیں یقین ہو جائے گا کہ ہم جو پیسہ لگا رہے ہیں، اس کا نفع واپس ملے گا۔ اس کی معقول اجرت ملے گی کہ نہیں اور جو بڑے فیصلے ایسے ہیں جو ملک چلانے سے متعلق ہیں، اس میں ہمیں بھی کچھ کہنے کا موقع ملے گا کہ نہیں۔ تو یہ ایک نیا سبب بنا جس سے پوری دنیا میں۔ مغربی دنیا تو تھی ہی۔ سارے کمیونسٹ بلاک میں، ایشیا میں، افریقہ میں جمہوریت کو بڑھاوا ملا ہے۔ دیکھیے، ہم لوگ جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی کے لوگ جمہوریت کو جو یہ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت، حاکمیت اللہ کے مقابلے پر ہے، دنیا میں کوئی اور یہ نہیں سمجھتا بلکہ جمہوریت کے معنی زیادہ تر لوگ بہت سادہ سمجھتے ہیں۔ جمہوریت اس کو کہتے ہیں کہ جس میں عام آدمی کو بھی فیصلہ کرنے میں کچھ دخل ہو، اس میں کوئی ایک دم بے اختیار نہ ہو؛ اور نہ کوئی اتنا با اختیار، طاقتور ہو کہ ساری قوت ایک ہی جگہ مرتکز ہو جائے۔ تو جہاں بھی چھوٹے پیمانے سے لے کر بڑے پیمانے تک فیصلوں میں عام انسانوں کو دخل نہ دیا جاتا ہو، وہ غیر جمہوری ہے؛ اور جہاں دخل دیا جاتا ہے، وہ جمہوری ہے۔ اور باقی جو بڑی بڑی باتیں ہم کہتے ہیں، وہ دوسری سطح کی ہیں، وہ اس وقت زیر بحث نہیں ہیں۔ میں جس معنی میں کہہ رہا ہوں کہ جمہوریت کو فروغ ملا، وہ یہ ہے کہ عام آدمی جس کو ملکی سطح پر فیصلوں سے دور رکھا جاتا تھا، اب حکمراں مجبور ہوئے کہ ان کو فیصلوں میں شریک کریں، اس لیے کہ ان کے لیے معاشی ترقی اور معاشی پیداوار کے لیے اپنے عوام کی خوش دلانہ شرکت ضروری تھی، اور خوش دلانہ شرکت اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ لوگ یہ محسوس کریں کہ ہماری رائے کا کوئی وزن ہے اور ہماری محنت کا پھل ہم تک واپس آتا ہے۔

جمہوریت کے فروغ کے ساتھ پوری دنیا میں یہ بھی ہوا کہ عورتوں کو جو ایشیا اور افریقہ میں خاص طور پر، اور باقی دنیا میں عام طور پر عرصے سے معیشت سے، سیاست سے، اور منجملہ سماج چلانے والے امور سے دور رکھا گیا تھا، ان کو اس کا موقع ملا کہ وہ ان میدانوں میں آئیں۔ عورتوں کو اس میدان میں موقع ملنے کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ مختلف اثرات کی وجہ سے پہلے کی بہ نسبت تعلیم میں رفتہ رفتہ آگے آئیں۔ پہلے ان میں خواندگی آئی، پھر علم اور معلومات آئیں اور

ان معلومات کے آنے میں صرف عام تعلیم کا دخل نہیں، وہ چیزیں جن کا ابھی میں نے ذکر کیا، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور ٹیلی ویژن۔ ان چیزوں کا بھی دخل ہے۔ اور جب انھوں نے تعلیم حاصل کر لی تو ان کو اس کا موقع ملا کہ وہ یہ ثابت کریں کہ وہ بال بچوں کی تربیت کے ساتھ، گھر چلانے کے ساتھ اور کام بھی کر سکتی ہیں۔ ویسے عقل عام بھی یہ کہتی ہے کہ زندگی تو ساٹھ پینسٹھ سال تک چلتی ہے، اس میں پندرہ سال ہی ایسے ہوتے ہیں جن میں بچہ پیدا کرنے اور بچوں کی تربیت کرنے میں کوئی بہت مصروف ہوتا ہے، تو اسی پندرہ بیس سال کی بات کو بعض لوگ توسیع دے کر اسے پچاس سال تک پھیلا دیتے ہیں۔ یہ عدل کے خلاف بات ہے۔ ایک عورت کو عورت کی حیثیت سے تمام ذمے داریاں ادا کرنے کے ساتھ سماج کے پیداواری عمل میں حصہ لینے کا کافی موقع مل سکتا ہے، اور سماج کے سیاسی امور میں دلچسپی لینے کا بھی موقع مل سکتا ہے، اور جنھیں اس کا شعور تھا انھوں نے یہ کر کے دکھایا۔ ایک بڑا سبب یہ ہو گیا کہ جب دنیا، مسابقت کی دنیا قرار پائی، خاص طور پر ترقی پذیر ممالک میں، تو یہ بات ممکن نہیں رہ گئی کہ آپ آدھی آبادی کو پیداوار دولت کے عمل سے مستقل طور پر دور رکھ کر کوئی مسابقت کر سکیں۔ چناں چہ ضروری ہوا کہ وہ عورتیں جو پیداوار دولت میں حصہ لے سکتی ہیں انھیں اس کا موقع دیا جائے، تو اس طرح بیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے جو لہر بہت پرزور طریقے سے آئی، وہ عورت کے حقوق کی بحالی اور جمہوریت کے آگے بڑھنے کی لہر تھی۔

نوجوانوں میں تشدد کا رجحان اور اسلامی تحریکوں کی الجھنیں

اب ایک اور تبدیلی کا ذکر کر رہا ہوں جس کا تعلق ہماری دنیا سے ہے، اسلام سے ہے، مسلمانوں سے ہے۔ بیسویں صدی میں سب سے بڑی جو تبدیلی آئی، وہ یہ تھی کہ جو ممالک پہلے استعمار کے زیر نگیں تھے، کالونی میں تبدیل ہوئے تھے، ایک ایک کر کے وہ سب آزاد ممالک میں تبدیل ہو گئے۔ ۱۹۴۵ء میں انڈونیشیا، ۱۹۶۳ء میں الجزائر اور ان دونوں تاریخوں کے درمیان وہ سارے ممالک جو مسلم اکثریت کے ہیں، جو کبھی فرانس کے، کبھی برطانیہ یا دوسرے ممالک کے غلام تھے، وہ سب آزاد ہوئے۔ یہ بہت بڑی تبدیلی ہوئی۔ جو مسلم اقلیتیں ہیں، وہ پہلے جتنی گمنام تھیں کہ ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا، وہ کیفیت جو صدی کے درمیانی حصے میں تھی، صدی کے آخر

تک آتے آتے حالت بدل گئی۔ ان میں بیداری آئی۔ چین کی مسلم اقلیت کو شامل کرتے ہوئے، وہ سیاسی حقوق رکھتی ہیں اور انھوں نے اپنے کو Assert کیا، اپنا وزن محسوس کرایا۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ دنیا کی کوئی مسلمان اقلیت ایسی نہیں ہے جو سیاسی حقوق سے محروم ہو لیکن حالات بہتر ہو گئے۔ ایک اور تبدیلی یہ ہوئی کہ بہت سی نئی اسلامی جمہوریتیں وجود میں آئیں، یہ بیسویں صدی کے اخیر میں ہوا۔ ان سب چیزوں کے ساتھ دو مزید تبدیلیاں اس صدی میں ہوئیں۔ پہلی تبدیلی پٹرولیم کی دریافت اور اس کے استعمال کا بڑھنا اور تیز رفتار صنعتی ترقی کا اس پر غیر معمولی انحصار، اور پٹرولیم کی عالمی پیداوار کا بہت بڑا حصہ اسلامی ممالک میں پایا جانا۔ اس سے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، بیسویں صدی کی ستر اور اسّی کی دہائیوں میں غیر معمولی دولت دنیائے اسلام کے بعض ممبران کے ہاتھوں میں آئی۔ جیسے بھی انھوں نے اسے استعمال کیا، اس کا فیض ان کو پہنچا، ہم کو پہنچا، اور پاس پڑوس کے تمام ممالک کو بھی پہنچا۔ بحیثیت مجموعی، تیل کی دولت جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی، اس نے عالمی بساط پر مسلمانوں کا وزن بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

دوسری چیز ساؤتھ ایسٹ ایشیا، خاص طور پر ملیشیا اور انڈونیشیا، ان دو ممالک کی تیز رفتار ۸ فیصد، ۹ اور ۱۰ فیصد سالانہ کی شرح تقریباً پندرہ بیس سال تک جاری رہی، جس سے دنیا کے اس گمنام گوشے میں دنیا کی مسلمان ریاستوں کا وقار بڑھا اور ساری دنیا میں یہ احساس بڑھا کہ یہ لوگ بھی فنی مہارت میں آگے نکل سکتے ہیں۔ انھوں نے غیر معمولی مہارت کمپیوٹر وغیرہ تیار کرنے میں، بعض ٹی. وی. اور ریڈیو کے پارٹس تیار کرنے میں حاصل کی۔ ان تمام چیزوں کے پیش نظر مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ گزشتہ صدی جس طرح سے شروع ہوئی تھی، اس کے مقابلے میں جب یہ صدی ختم ہوئی تو مسلمانوں کا وزن زیادہ تھا، وقار زیادہ تھا، ان کا چرچا زیادہ تھا؛ اور غالباً ان کے اندر خود اعتمادی بھی زیادہ تھی۔ افغانستان اور پھر عراق پر فوج کشی سے اس خود اعتمادی کو بڑا دھچکا لگا۔ لیکن اس سے پہلے بھی کئی ایسے حوادث ہوئے جن سے آپ یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں گے کہ لاچاری و بے وزنی عالمی بساط پر مسلمانوں کی زندگی کا ایک لازمہ ہے۔ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ جو بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں ہوا، عربوں کے بہت بڑے گروہ کا اس میں دخل تھا۔ انگریزوں نے سازش کر کے عربوں کو ذریعہ بنایا۔ آج تک انھوں نے جو سبز باغ عربوں کو دکھائے تھے، وہ خواب تو نہیں پورے ہوئے لیکن مسائل پیدا ہو گئے۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمے

کے بعد جو دوسری چیز قابل ذکر ہے، وہ اسرائیل کا قیام ہے۔ اسرائیل قائم ہوا، بغیر تیاری کے عرب ملکوں نے فوجیں بھیج دیں، پسپا ہوئے۔ اسرائیل کو ان حدود سے اور آگے بڑھنے کا موقع ملا جو حدود یو.این.او. میں مقرر کی گئی تھیں، وغیرہ وغیرہ تیسری بڑی ٹریجڈی عراق کے ساتھ ہوئی۔ ۱۹۹۱ء میں اور ۲۰۰۳ء میں بھی۔ جس طرح بغداد تباہ ہوا وہ آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ ہلاکو کے حملے کی داستانیں تاریخوں میں پڑھی ہیں مگر تازہ بربادیاں آپ نے خود آنکھوں سے دیکھی ہیں اور کوئی کچھ نہیں کرسکا۔ ہمارے اپنے ملک میں تازہ سانحہ گجرات کا اور اس سے پہلے المیہ بابری مسجد کا گرایا جانا ہے، وہ بھی ہماری لاچاری اور قوت سے محرومی کا ثبوت ہے۔ غرض، خلافت عثمانیہ کا خاتمہ، اسرائیل کا قیام، عراق کی بربادی اور بابری مسجد کا گرایا جانا۔ یہ عالم اسلامی اور مسلمانوں کی مجموعی طور پر لاچاری کا ثبوت ہے۔ ان ساری موافق باتوں کے ہوتے ہوئے جن کا اوپر ذکر آیا ہے، جب قوت کا مسئلہ آتا ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم قوت نہیں رکھتے۔ جو کچھ ہے، وہ سطحی چیز ہے۔

اب تحریک اسلامی کے تعلق سے بھی بعض باتوں کا جائزہ لینا ہے۔

تحریک اسلامی سے مراد وہ تحریکیں ہیں جو اسلامی نظام قائم کرنا چاہتی ہیں۔ سیاسی اقتدار میں شریعت کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ گفتگو کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کے لیے عرض کروں گا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی اور جو یہ مقصد نہ رکھتا ہو، وہ اسلامی نہیں ہے یا اسلام میں اس کی قدر نہیں ہے۔ اس تعریف کے تحت جماعت اسلامی، اخوان المسلمون اور اس قسم کی تحریکیں آتی ہیں جو ایک سیاسی فوکس رکھتی ہیں۔ ان کے اندر ۷۵ سال کا تجربہ ہے۔ ۱۹۲۶ء میں ایک بڑی کانفرنس اخوان المسلمون کی ہوئی تھی جس میں حسن البنا کا دیا ہوا مشہور لیکچر چھپا ہوا ہے۔ اور ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی قائم ہوئی لیکن صدی کی تیسری دہائی میں اس کا لٹریچر مولانا مودودیؒ کے ہاتھوں سے وجود میں آگیا تھا۔ اس تجربے سے دو تین چیزیں سامنے آتی ہیں: اس وقت کے اگر آپ رسالے اور رپورٹیں پڑھیں، ان لوگوں سے بات کریں، یوسف القرضاوی وغیرہ کی کتابیں پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ تین چیزیں اس وقت بہت نمایاں ہیں۔ پہلی چیز تشدد کا رجحان ہے۔ متعدد تحریکیں مصر و مراکش سے لے کر برصغیر ہند سے ہوتے ہوئے فلپین، ملیشیا، انڈونیشیا تک آج پائی جاتی ہیں جو اسلام کے نام پر تشدد کی قائل ہیں۔ حالاں کہ اصل اسلامی

تحریک کی فکر بالکل واضح ہے۔ جماعت اسلامی کا دستور تاکید کرتا ہے کہ ہم پرامن طریقے سے تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ تشدد اور طاقت کے استعمال کا مقصد کے حصول میں کوئی دخل نہیں ہے۔ طاقت (Force) کا استعمال، دفاع کے لیے ہم جائز سمجھتے ہیں لیکن اپنے کسی ایجابی مقصد کے حصول کے لیے اسلامی تحریکات نے طاقت کو ذریعہ نہیں مانا ہے، مگر بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں سب سے پہلے تشدد کی لہر مصر میں چلی۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں کہ اس کے ذمے دار مصر کے حکمراں تھے۔ انھوں نے ۱۹۵۴ء سے اخوان المسلمون پر اس طرح کے مظالم ڈھانے شروع کیے جس کا نقطہ عروج سید قطبؒ کی شہادت ۱۹۶۶ء کی صورت میں سامنے آیا۔ ہر چیز کا سبب ہوتا ہے۔ تشدد کے دہشت گردانہ رجحان کے ظہور کا بھی کوئی نہ کوئی سبب تھا۔ میں اس سبب کو یا اس کے صحیح یا غلط ہونے کا ذکر نہیں کر رہا ہوں، میں تو ایک مظہر (Phenomenon) اور ایک امر واقعہ آپ کو بتا رہا ہوں کہ کوئمبٹور ہو یا منیلا، جکارتہ ہو یا قاہرہ یا دمشق۔ ہر جگہ آپ کو ایسے مسلمان نوجوان ملیں گے جو خود یا ان کے باپ یا ان کے بزرگ ان تحریکات سے متعلق رہے ہیں لیکن اب وہ یہ کہتے ہیں کہ بہت دیکھ لیا۔ پرامن جمہوری طریقوں سے کوئی اسلامی تبدیلی نہیں آتی۔ برصغیر ہند میں یہ رجحان، انقلاب ایران کے بعد سے شروع ہوا۔ ہمارے بعض طالب علم ساتھیوں نے اس طرح کی باتیں کہنا شروع کیں کہ بغیر انقلاب کے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے اصل تحریکیں سوچ میں پڑ گئیں کہ کریں کیا؟ کیسے اپنے لوگوں کو اس فکر پر واپس لائیں کہ ہم دنیا کو سدھارنے کے ٹھیکیدار نہیں ہیں۔ ہم تو ایک امتحان سے گزر رہے ہیں اور امتحان سے گزرنے کا طریقہ یہ ہے کہ امتحان لینے والے نے جو طریقہ بتایا ہو، اس کے مطابق عمل کیجیے، نتیجہ ظاہر ہوگا تو ہوگا، نہیں تو نہیں ہوگا۔ دنیا جس نے بنائی ہے، وہ جانے! ہم آپ کون ہوتے ہیں اس کی ذمے داری لینے والے؟ تو یہ صبر ہم ان نوجوانوں میں کیسے واپس لائیں کہ ہم امن سے وابستہ رہیں۔

پچھلے دنوں ایک عربی رسالے میں ایک مضمون ڈاکٹر عبدالحمید ابوسلیمان کا آیا ہے۔ جس کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں پرامن رہنے کا جو مسلک ہے، یہ کوئی مصلحت کی بات نہیں ہے کہ ہم تشدد کے قائل نہیں ہیں۔ ہم طاقت استعمال کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ یہ اصول کی بات ہے۔ ہمیں اس کی اجازت ہی نہیں کہ ہم طاقت کا استعمال کریں۔ یہ فکر بجا

ہے۔ تشدد کا استعمال جیسے ہی شروع ہوتا ہے، عقلی استدلال اور اخلاقی اقدار کی اثر پذیری ختم ہو جاتی ہے۔ ۱۹۶۵ء یا ۱۹۶۶ء کی بات ہے۔ کچھ عرب نوجوان مولانا مودودیؒ سے ریاض میں ملے تھے۔ انھوں نے مولانا سے کہا تھا کہ ''آپ اپنے ملک میں الیکشن میں حصہ لے سکتے ہیں اور الیکشن میں تقریریں کر سکتے ہیں، آپ کے ملک میں جمہوریت ہے لیکن ہم لوگ تو یہ سب نہیں کر سکتے۔ ہم لوگ تو مجبور ہیں کہ خفیہ تحریک چلائیں۔ اور جب خفیہ تحریک چلائیں گے تو اس میں تشدد تو استعمال کرنا پڑے گا۔'' تو مولانا نے فرمایا تھا کہ آپ اس طریقے سے جو تبدیلی لائیں گے، وہ اسلامی نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طریقے سے جو اقتدار حاصل کرے گا وہ اقتدار باقی رکھنے کے لیے بھی یہی طریقہ استعمال کرے گا۔ آپ نے متعدد ایسے انقلابات دیکھے ہوں گے۔ ایسے انقلابات میں سب سے پہلے جو آدمی مارا جاتا ہے، وہ انقلاب لانے والے کا قریبی ساتھی ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ وہ انقلاب یا وہ تبدیلی جو خفیہ سرگرمیوں اور تشدد سے آئے، اس میں یہ بات بہت اہم ہوتی ہے کہ کوئی آدمی دشمن سے نہ مل رہا ہو، کوئی اس کی خبر نہ دے رہا ہو، کوئی اپنے کو اقتدار میں لانے کی کوشش نہ کر رہا ہو۔ جیسے ہی ایسا شبہ ہوتا ہے، قتل کے علاوہ اس کو خاموش کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ کہ انھوں نے کہا کہ ہم جو تبدیلی چاہتے ہیں، وہ ان لوگوں کے ذریعہ ہی آسکتی ہے جو راضی خوشی اسلام کو قبول کریں۔ نہیں قبول کرتے تو جائیں گے، اللہ کو جواب دیں گے، لیکن زبردستی کر کے ان پر کوئی چیز تھوپنے سے تو اسلام نہیں، کچھ اور آسکتا ہے۔ ہمارے بزرگ ہر جگہ اس رجحان سے پریشان ہیں اور کچھ مصلحتوں کی وجہ سے جن کا میں قائل نہیں ہوں، یہ باتیں تحریر میں کم آتی ہیں کہ تشدد کی اس لہر کو کیسے روکا جائے۔ یہ پریشانی آپ کو زبانی سننے میں زیادہ آئے گی۔

دوسرے مسئلے کا تعلق مسلم اکثریت والے علاقوں سے ہے۔ چالیس سال سے یہ دیکھا جا رہا ہے کہ اسلامی تحریکیں اپنے ہی حکمرانوں سے الجھتی رہتی ہیں۔ اسلامی تحریکوں کی زیادہ تر قوت اپنے اپنے ملکوں کے اندر جو حکمراں تھے، ان سے الجھنے میں صرف ہو گئی۔ ظاہر ہے، یہ سلسلہ حکمرانوں کی طرف سے شروع ہوا۔ ظلم انھوں نے ڈھائے، پابندیاں انھوں نے لگائیں۔ لیکن عملاً جو نتیجہ نکلا وہ یہ کہ ان تحریکوں کی گفتگوئیں، ان کی تقریریں اور ان کی کوششیں عام انسانوں کو ہدف بنانے کی بجائے مسلمانوں ہی میں سے بعض لوگوں، مثلاً حکمرانوں کو ہدف بنانے لگی ہیں۔

ہمارا Focus یعنی مرکز توجہ عامۃ الناس نہیں رہ گئے۔ بات یہاں سے چلی تھی کہ ہم امت مسلمہ نبی اکرم ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد عام انسانیت تک وہی وظیفہ ادا کرنے اٹھے ہیں جو نبی کیا کرتے تھے۔ ہم کو ''شہادت علی الناس'' کا، ''امت وسط'' کا، ''کنتم خیر امة'' کا وظیفہ ادا کرنا ہے کیوں کہ امت بھولی ہوئی ہے۔ لہٰذا ہم نے جماعت بنائی۔ جماعت کا کام یہ ہے کہ امت کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ متحرک (Mobilize) کر کے اس کام پر واپس لائے لیکن دوسری طرف یہ کام بھی کرتی رہے۔ یعنی عام انسانوں تک دعوت پہنچائے۔ آپ کے پاس پالیسی پروگرام کا موجودہ میقات کا جو بیان ہے، اس میں پہلے نمبر پر نصب العین کا ذکر ہے اور دوسرے نمبر پر عام انسانوں کو دعوت کا؛ پھر تیسرے نمبر پر مسلمانوں میں کام کا ذکر ہے۔ ترتیب دیکھیے کہ ہم نے اپنے کاموں کی ترجیح کیا مقرر کی ہے، اس میں عام انسانوں کو دعوت پہنچانا پہلے لکھا ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور دعوت بعد میں آئی ہے لیکن اگر آپ جائزہ لیں ان لوگوں کو چھوڑ کے جو یورپ اور امریکہ میں مقیم ہیں، اور ان تحریکوں سے وابستہ ہیں، تو دیکھیں گے کہ عام انسانوں کو مخاطب کرنا اسلامی تحریکات کی ان جماعتوں میں جو مسلم اکثریت والے ممالک میں پائی جاتی ہیں، تقریباً بند ہے۔ آپ اس کو کسی بھی طریقے سے کسی بھی معیار پر جانچ لیں، ان کی زیادہ تر قوت ان کے اپنے ملک کے سیکولر عناصر سے، اپنے حکمرانوں سے نبرد آزما ہونے میں لگ گئی۔ اب ۷۵ سال کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارا یہ تصور نہیں تھا جو ہم سوچتے تھے؛ جو ہم چاہتے ہیں، وہ کچھ اور ہے!

تیسری بات جس کا ذکر کرنا چاہوں گا، وہ یہ ہے کہ آج انسان بہت سے سنگین مسائل میں مبتلا ہے۔ ظاہر ہے، ہم ان کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے حوالے سے دعوت بھی پیش کرتے ہیں لیکن دھیرے دھیرے یہ احساس ہو رہا ہے کہ ان مسائل میں تو ہم بھی مبتلا ہیں۔ خاندان کا ادارہ اگر کمزور پڑ رہا ہے تو صرف امریکہ ہی میں نہیں کمزور پڑ رہا ہے بلکہ ہندوستان میں بھی کمزور پڑ رہا ہے۔ اسی طریقے سے سڑکوں پر امن و امان اگر کم ہو رہا ہے تو صرف لاس اینجلز ہی میں نہیں کم ہو رہا ہے، دہلی میں بھی کم ہو رہا ہے۔ اسی طریقے سے عام انسانی اخلاقیات میں گراوٹ غیر مسلم سماج میں آئی ہے تو ہمارے اندر بھی آئی ہے؛ اور غربت، امیر غریب کے درمیان بڑھتے ہوئے فرق اور کرپشن وغیرہ جتنے بھی مسائل آپ گناتے چلے جائیے، سب ہمارے سماج میں بھی ہیں۔ تو

یہ احساس ہوتا ہے کہ اس بات سے کام نہیں چلے گا کہ آج یورپ، امریکہ، ہندوستان یا کسی اور ملک کے خرابیوں یا موجودہ مسائل کو گنائیں اور کہیں کہ ان سب کا سبب ایک غلط نظام کی پیروی میں ہے۔ آپ نے دعوت قبول کرلی تو یہ مسائل ختم ہوجائیں گے۔ اب یہ احساس ہورہا کہ ان مسائل کے عملی حل کے لیے جب تک ہم اور وہ۔ دونوں مل کے کوشش نہیں کریں گے، تب تک ان مسائل میں ہم بھی مبتلا ہوتے جائیں گے۔ ہمیں بھی تکلیف ہوگی، ہمارے لوگ بھی بے روزگار ہوں گے، ہماری اگلی نسل بھی معاشی بنیادوں پر متاثر ہوگی۔ واقعہ یہ نہیں کہ ہم کسی منبر پر کھڑے ہیں اور انسانیت ہمارے سامنے ہے ہم اسے بتارہے ہیں کہ تمہارے مسائل اتنے سنگین ہیں، ان سے نکلنے کا حل یہ ہے؛ اس کے بجائے اب یہ احساس ہورہا ہے کہ مسائل میں ہم اور وہ۔ دونوں شریک ہیں، ان کے پیدا ہونے میں بھی کچھ ہمارا اور کچھ ان کا حصہ ہے۔ ان مسائل کی ذمہ داری تمام تر اس بات پر نہیں ڈالی جاسکتی کہ انھوں نے کلمہ نہیں پڑھا ہے، کلمہ تو ہم نے پڑھ رکھا ہے۔ کہیں کچھ اور خامی بھی ہے، کچھ اور کمزوریاں ہیں جو مسائل پیدا کررہی ہیں۔

کیا بات ہے کہ ہمارے یہاں کوئی وعدہ کرتا ہے تو اس کو پورا نہیں کرتا، وقت دیتا ہے تو وقت پر نہیں آتا یعنی بنیادی انسانی اخلاقیات کمزور ہیں، اور سنتے ہیں کہ دوسرے ممالک میں، امریکہ میں کم سے کم یہ بات نہیں۔ بنیادی اخلاق اچھے ہیں۔ جو فطری انسانی رجحانات ہیں، جن کو بنیادی انسانی اخلاقیات کہا جاتا ہے، ان کی اہمیت مولانا مودودیؒ کی کتاب ''تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں'' میں واضح کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیوں کمزور پڑتی ہیں؟ اس کا تعلق صرف نظام سے نہیں، کچھ اور چیزوں سے بھی ہے۔ کچھ خرابیاں ایسی ہیں جس میں دوسروں کی طرح ہم بھی مبتلا ہیں اور اس کے اسباب تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح کی ایک خرابی یہ ہے کہ ہمارے اندر ملکی قانون کی پابندی کا کوئی مضبوط رجحان نہیں ہے اور ہم بحیثیت شہری، اپنے فرائض ادا کرنے میں تساہل برتتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں اللہ کے قانون کی پابندی کرنی ہے، البتہ انسانوں نے جو قانون بنا رکھے ہیں، انھیں جب چاہا مانا، جب چاہا نہ مانا۔ غیر ملکی زرمبادلہ کو ''حوالہ'' سے بھیجنے اور بینک سے بھیجنے میں کیا فرق ہے؟ سامان کو بغیر کسٹم کے ملک میں لانے، انکم ٹیکس ادا کرنے، وغیرہ جتنے بھی قوانین ہوتے ہیں، الا ماشاء اللہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ انسانی قوانین ہیں، ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ شہریت (Citizenship) کی ذمے داری

کے پورے نظام کے بارے میں جو اصل فکر ہے، وہ یہ ہے کہ ہم جس ملک کے شہری ہیں، اس میں ہم ایک معاہدے کے پابند ہیں۔ شہریت کے تمام فرائض ہمیں ادا کرنے ہیں، سوائے ان فرائض کے جو معصیت پر اور برے کام کرنے پر محمول کیے جائیں۔ لیکن عام رجحان یہ ہے کہ شہریت کے حقوق کو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا ورثہ ہے، ہمیں ملنا چاہیے؛ لیکن شہریت کے فرائض کو ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ یہ عام بات ہے جو ہندوستان کے ہندوؤں میں بھی ہے، اور مسلمانوں میں بھی، اور دوسرے لوگوں میں بھی۔ میرا مشاہدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ہی نہیں، پاکستان کے لوگوں میں بھی، حتی کہ ہمارے جو بھائی امریکہ میں جا کے رہتے ہیں، وہ بھی دوسرے ملک کے قانون کو اپنے حق میں استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے لیکن وہ اس قانون کی پابندی، شہری کی حیثیت سے کرنے کے عادی ہو جائیں، یہ کم ہوتا ہے۔ خواہ قانون کے ڈر سے وہ پابندی کرنے لگیں لیکن مومن کا ضمیر اسے اچھا شہری بنانے کی طرف نہیں لے جاتا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس پر سنجیدگی سے غور ہونا چاہیے اور لکھا جانا چاہیے۔

۱۹۹۵ء میں قاہرہ کی ایک ایسی مجلس میں، جس میں کچھ لوگوں کو جنھیں پہلے فیصل ایوارڈ مل چکا تھا، بولنے کا موقع دیا گیا تھا، ان میں سے ایک علی عزت بیگووچ، بوسنیا کے صدر بھی تھے۔ انھوں نے اپنے مقالے میں۔ جو چھاپا نہیں گیا۔ آخر میں ایک بات کہی تھی کہ میرے ذہن میں چار سوال ہیں، اور میں چاہتا ہوں کہ جوان سوالوں کا تسلی بخش جواب دے، اس کو ''خدمت اسلام'' کا ''فیصل ایوارڈ'' ملے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ ہماری امت جس کو اللہ نے مخاطب کیا تو اس کا پہلا لفظ تھا اقرأ۔ آج ساڑھے چودہ سو سال گزر جانے کے بعد اس امت کی پچاس فیصد سے زیادہ تعداد پڑھنے سے قاصر کیوں ہے؟ ہم دنیا میں سب سے جاہل کیوں ہیں جب کہ ہم سے پہلی وحی میں کہا گیا تھا کہ ''پڑھ''۔ دوسری بات یہ کہ اسلام میں وقت کی پابندی پر بڑا زور ہے۔ نماز کا وقت مقرر، حج کی تاریخ مقرر، روزے کا مہینہ مقرر، زکوٰۃ سال گزر جانے پر، ہر چیز کا وقت مقرر ہے لیکن دنیا میں سب سے زیادہ کم وقت کی پابندی ہم کرتے ہیں۔ آج تک مجھے نہیں معلوم کہ مسلمانوں کا کوئی جلسہ وقت پر شروع ہوتا ہو۔ اب سے کچھ سال پہلے رباط میں تنظیم اسلامی کانفرنس (OIC) کی ایک چوٹی کانفرنس تھی، مسلمان ملکوں کے بادشاہ، صدر مملکت وغیرہ شریک تھے۔ یہ جلسہ کوئی ۹ گھنٹہ دیر سے شروع ہوا۔ تیسری بات انھوں نے یہ کہی کہ طہارت، اس دین

میں بہت اہم ہے۔ اس کی نماز، اس کا روزہ، اس کی ہر عبادت میں پاکیزگی اور صفائی ستھرائی پر زور ہے؛ مگر دنیا کے کسی بھی مسلم محلے میں جایئے، ایشیا کے کسی ملک میں، افریقہ میں، مغربی ممالک میں مسلمان آبادیوں میں کہیں بھی چلے جایئے۔ سب سے گندے، مسلمانوں کے محلے ہیں۔ کاغذ کہیں بھی پھینک دیں گے، چھلکا کہیں بھی ڈال دیں گے۔ اور آخری چیز انھوں نے یہ کہی کہ وہ امت جو کلمۂ توحید پر قائم ہے اور ایک خدا کے تصور کو، ساری انسانیت کو ایک لڑی میں پرونے والی چیز سمجھتی ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ یہ امت دن بہ دن مزید گروہوں میں بٹتی جارہی ہے۔ آپ نے ایبا (Ameba) کے بارے میں پڑھا ہوگا کہ ایک سے دو، دو سے چار، چار سے آٹھ بنتا جاتا ہے۔ تو انھوں نے کہا کہ کہیں بھی چلے جایئے، وقت گزرنے کے ساتھ گروہ بڑھتے جارہے ہیں، حلقے بڑھتے جارہے ہیں۔ ایک جماعت سے دو جماعت، دو سے چار جماعتیں، ایک حلقے سے دو حلقے بنتے جاتے ہیں۔ تو انھوں نے کہا کہ یہ چار سوال مجھے بہت پریشان کرتے ہیں۔ یہ ناخواندگی، یہ وقت کی عدم پابندی، یہ عدم صفائی، یہ انتشار۔ یہ کہاں سے اس امت میں آگئے؟

نئے مواقع، نئے تقاضے

میرے خیال میں دنیا میں واقع ہونے والی فنی تبدیلیاں زیادہ تر خوش آئند ہیں اور ہمارے لیے نئے نئے مواقع پیدا کرتی ہیں۔ ان میں کوئی پرخطر چیز نہیں۔ خود تحریک اسلامی کی صفوں میں ان باتوں کا شعور ایک خوش آئند بات ہے۔ اس بات کی آگاہی کہ ہمارے درمیان تشدد کے قائل گروہ کیوں پیدا ہورہے ہیں؟ یا ہم اپنی طاقتوں کو آپس میں الجھنے میں صرف کرنے کے بجائے کس طرح انسانیت پر صرف کریں۔ ہم اپنے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کا طریقہ کیسے بدلیں، تاکہ ہمارے اندر ذمہ دارانہ کردار پیدا ہو؟ ان کمزوریوں کی طرف توجہ کافی خوش آئند چیزیں ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کرنا کیا چاہیے؟ میں آپ کو ایک جملہ یاد دلانا چاہتا ہوں جو جماعت کے تاسیسی اجتماع میں مولانا مودودیؒ کی پہلی تقریر کا حصہ ہے اور جو روداد جماعت اسلامی حصہ اول میں ہے، پڑھیے گا؛ اس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے:

''سارے انسانوں کے مسائل زندگی، ہمارے مسائل زندگی ہیں۔''

تو میرے خیال میں ہمیں مستقبل کی طرف بڑھنے میں سب سے بڑی چیز جو مدد دے

سکتی ہے، نئے زمانے کے مواقع سے فائدہ اٹھانے میں معاون بن سکتی ہے، وہ یہ کہ ہم اپنا فوکس اپنے اوپر سے اور مسلمانوں کے اوپر سے ہٹا کے نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ، عام انسانوں کو بنائیں اور انسانوں کو فوکس بنانے میں ایک چیز کا خیال رکھیں کہ آپ کسی کو حقیر سمجھ کر یا ذلیل سمجھ کر اس کو ٹھیک نہیں کر سکتے جب تک کہ آپ اس کو سمجھیں نہیں کہ وہ آج کیا ہے اور کیوں ہے، اور اسے مقام تو قیر نہ دیں، اس وقت تک اسے مخاطب نہیں بنا سکتے۔ عزت کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اس کو برحق سمجھ لیں لیکن اس کا مطلب یہ ضرور ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو درجہ بحیثیت انسان دیا ہے، اس کا اعتراف کریں۔ اس چیز کا آپ انکار کریں گے تو اس شخص کو آپ دعوت کا مخاطب نہیں بنا سکتے۔

ہمارے یہاں ایک رکن ہیں، بڑے لائق! وہ علی گڑھ میں ایک مقامی اجتماع میں تقریر کر رہے تھے، ان کی پوری تقریر ''ہنود'' 'یہود' اور 'کفار' جیسے الفاظ سے بھری ہوئی تھی اور موضوع یہ تھا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے، جماعت کو کیا کرنا چاہیے؟ باہر نکلے تو ان سے میں نے کہا کہ میں آپ کے سامنے یہ تجویز رکھنا چاہتا ہوں کہ جماعت اسلامی کا دستور اور جماعت اسلامی کی پالیسی پروگرام دیکھ کر مجھے بتائیے کہ دونوں میں ''کافر'' کا لفظ کتنی بار آیا ہے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ لفظ ''کافر'' ہمارے دستور یا پالیسی پروگرام میں نہیں آیا ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیے کہ سہو ہو گیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ بھول ہوگئی ہو کہ دستور بناتے وقت ''کافر'' کا ذکر نہیں کیا اور ''یہود'' تو خیر دور تھے۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ آپ کی تقریر میں ان لوگوں کا ذکر نہیں آیا جن کو قرآن نے ''الناس'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ آخر وہ کہاں گئے؟ بہت سے لوگ ہیں، جنھوں نے غیر مسلم بھائیوں میں بہت کام کیا ہے اور اپنے تجربات بیان کیے ہیں اور ان سے ہم مستفید بھی ہوئے ہیں۔ یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم نے جو بھی رابطہ کیا ہے، اس میں ہماری ہمت افزائی ہوئی ہے۔ واقعی وہ لوگ ہم سے انسانوں کی طرح پیش آئے۔ جو ٹیکنیکل پوزیشن ہے، وہ یہ کہ ہمیں کسی کو ''کافر'' کہنے کا اس وقت تک حق نہیں پہنچتا جب تک ہمیں معلوم نہ ہو کہ اس تک دعوت پہنچی یا نہیں؛ اور ظاہر ہے کہ انسانیت کی عظیم ترین اکثریت کی حیثیت یہی ہے، تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں ان کی انسانیت پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ برابر بھائی کی حیثیت سے ہمیں ان کے قریب آنا چاہیے۔ قریب آنے کی ہمارے یہاں ایک ترتیب ہے کہ پہلے تو اس کی غلط فہمیاں دور ہوں اور جو بے زاری کسی

وجہ سے ان میں پیدا ہوئی ہے، وہ دور ہو۔ برابر کا انسان سمجھ کر ہم ان سے ربط وتعامل کریں چاہے وہ تعامل محلے کی صفائی کے معاملے میں ہو یا ملک کو فحاشی سے بچانے کی کوشش میں۔ اس کے بعد ہی ہمیں موقع ملے گا کہ ہم دعوت ان تک پہنچا سکیں، جیسا کہ ہم نے ''قرآن کے ہفتے'' میں پہنچایا، ''رحمۃ للعالمین'' کے ہفتے میں پہنچایا۔ اس میں جو اہم بات ہے، وہ یہ کہ جب مسائل کی بات آتی ہے تو بہت سے مسئلے ایسے ہیں کہ ہمیں اپنے مشترک مسئلے کے طور پر ان کو زیر غور لانا ہوگا۔ مثلاً غریبی کے مسئلے کو لیجیے۔ جب یہ سوچیں گے کہ یہ ہمارا اور ان کا مشترکہ مسئلہ ہے اور ان سے گفتگو کریں گے تو نئی فضا بنے گی۔

ابھی ہمارے ایک دوست پٹنہ سے آئے تھے اپنے یہاں لے جانے کے لیے؛ میں وہاں نہ جاسکا۔ وہ جماعت کے تھے۔ انھوں نے ایک بات کہی تھی، دیکھیے ہمارے بہت سے غیر مسلم ساتھی ایسے ہیں جو ملک کے موجودہ مسائل پر گہرائی سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں، ان میں سے ایک مسئلہ تشدد کی طرف رجحان بھی ہے ہمارے اور آپ کے لیے تو یہ بہت چھوٹا مسئلہ ہے لیکن جو اکثریت ہندو کمیونٹی کی ہے، اس کے لیے یہ مسئلہ زیادہ سنگین ہے۔ آسام، بنگال، آندھرا پردیش، یا ملک کے کسی اور حصے میں جو تشدد کرتا ہے اور جو تشدد چھپ کے کیا جاتا ہے تو اس کی شکل یہی ہوتی ہے جو عرف عام میں ''ٹیرورزم'' (دہشت گردی) کہا جاتا ہے۔ تو وہ اس کے اسباب ومحرکات پر گہری تحقیق اور تبادلۂ خیال کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے سماج میں ٹیرورزم کیوں پیدا ہورہا ہے۔ دوسرا مسئلہ جرائم (Crime) کا ہے۔ دیکھیے، ہم بہت آسانی سے بعض چیزوں کی گہرائی میں جائے بغیر کہہ دیتے ہیں کہ لوگ اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہیں، اس لیے زوال پیدا ہورہا ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں۔ اب آخرت سے لاپروائی، خدا ناشناسی بھی ازلی اسباب ہیں؛ ان سے انکار نہیں ہے، لیکن اضافی اسباب ڈھونڈیے۔ مثال کے طور پر ایک ایسی سوسائٹی جس میں کچھ لوگ بے تحاشہ امیر ہوتے چلے گئے، تھوڑے عرصے میں بہت زیادہ ان کے پاس دولت آئی، بڑے بڑے ان کے مکان بنے، ہر طرح کی آسائشیں۔ جن کا ہم تصور نہیں کرسکتے۔ انھیں ملیں، ان کے مکانوں میں جو صفائی کرنے والا آتا ہے، پلمبر آتا ہے، کوئی اور اس طبقے کا آدمی آتا ہے، وہ صبح شام یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے لیے کوئی موقع نہیں، ہم اس کے عشر عشیر تک نہیں پہنچ سکتے، ہم کیا کرسکتے ہیں؟ کرائم اس طرح بھی پیدا ہوتا ہے! جب بہت تیز رفتاری

سے لوگ اپنی زندگی کو بدل نہیں سکتے تو ان کے لیے ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جو چیز جہاں ہاتھ لگے، لے لو۔ یہ سرسری رائے نہیں بلکہ ریسرچ کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح جس سماج میں نارمل بحث مباحثے یا گفتگو کے راستے بند ہوتے ہیں اور ایک جابر اور کرپٹ حکومت حاوی ہوتی ہے، ہر جگہ رشوت، ہر جگہ غنڈہ گردی کا دور دورہ ہوتا ہے تو بعض لوگوں میں اپنی جگہ اپنے مقصد کو صحیح سمجھتے ہوئے چھپ کے قوت کے استعمال کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ سارے مسائل کی جڑیں آخرت کو بھولے رہنے میں ہیں۔ وجہیں اور بھی ہوتی ہیں، اور ان وجہوں پر بحث و مذاکرہ کے لیے اپنے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ ہمیں ملنا چاہیے۔ اگر ہم نہیں ملیں گے تو یہی نہیں کہ ان کے مسئلے حل نہیں ہوں گے، ان کی فیملی برباد ہوگی، ہماری بھی بربادی ہوگی، ہمارے مسئلے بھی حل نہیں ہوں گے۔ ہمیں صرف مسلمانوں کے درمیان سرگرم رہنے کا طریقہ چھوڑنا چاہیے۔ میری مراد صرف جماعت اسلامی سے نہیں ہے، وہ تو کچھ عرصے سے عام انسانوں میں کافی کام کر رہی ہے۔ تمام تحریکات، جماعت اسلامی پاکستان ہو، اخوان المسلمون ہو، کوئی اسلامی گروہ ہو، اس کے لیے اکیسویں صدی کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنا فوکس عام انسان کو بنائیں۔ دوسرے یہ کہ سنجیدگی کے ساتھ یہ سمجھیں کہ صرف اپنے مسائل کی فکر نہ کریں۔ کوئی مسئلہ ہم اکیلے حل نہیں کر سکتے، ہم سب مل کر ہی حل کر سکتے ہیں۔ یہ چیز بھی اپنے ذہن سے نکال دینی چاہیے کہ ہر مسئلے کا ایک ہی حل ہے، اور وہ حل ہمیں معلوم ہے۔ دنیا میں بیشتر مسائل ایسے ہیں کہ ان کا حل دنیا میں کسی کو نہیں معلوم! اس میں جماعت اسلامی کے لوگ بھی شامل ہیں۔ مسائل بہت پیچیدہ ہیں۔ چاہے غربت ہو، ناخواندگی ہو، کرائم ہو، عریانیت و فحاشی ہو۔ ہر مسئلے کے بہت گہرے اسباب ہیں، اور ان کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے جتنی روشنی ہمیں میسر ہو، روحانی اثرات میں ہمیں جو کچھ مل سکے، وہ سب کچھ درکار ہے۔

بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کو سمجھنے میں بہت وقت لگے گا اور صرف ہم اکیلے ان کو نہیں سمجھ سکتے۔ جب ہم سمجھ لیں گے تو انھیں حل کرنے کے لیے بہت قوت درکار ہوگی جو دوسروں کے ساتھ مل کر ہی میسر آسکتی ہے۔ جب تک انکسار و تواضع پیدا نہیں ہوتی، خاکساری اور تواضع نہیں ہوتی مسائل کے حل کے لیے فضا سازگار نہ ہوگی۔ اہل حق میں جو سب سے بڑی خرابی پیدا ہوسکتی ہے، وہ کبر نفس ہے۔ یہ خیال کہ ہمارے پاس سب کچھ ہے؛ ہم جانتے ہیں کہ صحیح کیا ہے،

دنیا کو صحیح نہیں معلوم، ہم حل کر سکتے ہیں، دنیا حل نہیں کر سکتی۔ ان خیالات سے بچنا چاہیے اور تواضع اختیار کرنا چاہیے۔ ہمارے پاس بہت کچھ ہے لیکن یہ احساس ضروری ہے کہ ہم نے جو کچھ سیکھا ہے، اس سے زیادہ بہت کچھ سیکھنا ہے۔ ہم دنیا کو بہت کچھ سکھا سکتے ہیں لیکن یقین مانیے، آپ کو دنیا سے سیکھنا بھی ہے۔ جب تک یہ چیز ہمارے اندر نہیں آئے گی، ہم اکیسویں صدی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور یہ نقشہ ہمارے بعض لوگوں کے ذہن میں نادانستہ طور پر بنا ہوا ہے کہ یہ دنیا صرف مردوں کے لیے ہے اور مردوں کے لیے عورتیں بنائی گئی ہیں۔ یہ نقشہ، سنت کا نقشہ نہیں ہے، یہ اسلام کا مزاج نہیں ہے، یہ ہماری غلط فہمی ہے۔ انسانیت مرد و عورت۔ دو اصناف پر مشتمل ہے۔ دونوں اللہ کے یہاں جواب دہ ہیں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں عورت و مرد میں کوئی جوہری فرق نہیں، روحانی اور اخلاقی طور پر دونوں برابر ہیں۔ جو فرق آتا ہے، وہ اس کے بعد ہے۔ چناں چہ اس صدی میں نئے چیلنجوں کے مقابلے کے لیے ہم اپنے ساتھ عورتوں کو بھی رکھیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو شاید ہمارے لیے اکیسویں صدی بہت اچھی ہوگی، ان شاء اللہ!

تشدد، اسلام اور تحریک اسلامی

انسانی زندگی میں تشدد کا کیا مقام ہے؟ اسلام نے کن حالات میں تشدد کو روا رکھا ہے اور کب اس کی اجازت دی ہے کہ تشدد مسلح جنگ کی شکل اختیار کر لے۔ ایسی صورت میں اس نے جنگ کو کن آداب کا پابند بنایا ہے؟ تشدد کب دہشت گردی قرار پاتا ہے، کیا اسلام کسی حالت میں بھی دہشت گردی کی اجازت دیتا ہے؟ زیر نگاہ مقالہ انہی سوالات کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے مگر ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ ان میں سے کسی بھی سوال پر علمی بحث کے تقاضے کما حقہ پورے کر سکیں۔ تشدد اور دہشت گردی کو موضوع بحث بنانے کی اصل وجہ موجودہ صورت حال ہے۔ بہت سی جگہوں پر مسلمانوں کو تشدد اور دہشت گردی کا ہدف بنایا جا رہا ہے۔ اور بہت سی جگہوں پر مسلمان بھی تشدد اور دہشت گردی کا طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ کیا مسلمانوں کے لیے ایسا کرنا جائز ہے؟ کیا ایسا کرنے سے انہیں کوئی فائدہ ہوا ہے؟ کیا مسلمانوں کی طرف سے جوابی تشدد ان پر کیے جانے والے تشدد کو روک سکے گا؟

اس وقت عالمی سطح پر عراق کے خلاف امریکی و برطانوی جارحیت اور ملکی سطح پر جارحانہ ہندوتو کی لہر نے اسلامی حلقوں میں گہری بے چینی پیدا کر رکھی ہے۔ لوگ مستقبل کے بارے میں بہت اندیشہ ناک ہیں ایسی صورت حال میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے کیا کیا جانا چاہیے؟ یہ مقالہ اسی سوال کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔

تشدد اور اخلاق

تشدد اصلاً ایک غیر اخلاقی عمل ہے۔ اخلاقی اصولوں پر کاربند مہذب سماجی زندگی میں تشدد کی اجازت صرف جرم کی سزا کے طور پر (تاکہ جرائم کا سدباب ہو سکے) اور دفاع کے لیے

دی جاسکتی ہے (تاکہ خود کو دوسروں کے تشدد سے محفوظ رکھا جاسکے)۔ اس کے علاوہ کسی حال میں تشدد کا استعمال ناروا ہے۔ کسی مقصد کو حاصل کرنے کا راستہ افہام وتفہیم، دعوت وتبلیغ اور ترغیب و ترہیب ہے نہ کہ تشدد۔ دینی مقاصد کے لیے تو تشدد کا استعمال بالکل ہی نامناسب ہے کیوں کہ تشدد جبر واکراہ کا آلہ ہے جب کہ دین میں جبر واکراہ کی کوئی جگہ نہیں۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۚ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (البقرہ:۲۵۶)

''دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کرے اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اسلام مرحمت وشفقت، رواداری اور نرم روی، اور عفو ودرگزر پر مبنی ہے۔ مار پیٹ، توڑ پھوڑ، درشتی اور سخت گیری اس کے مزاج سے مناسب نہیں رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ (الاعراف:۱۹۹)

''اے نبیؐ نرمی اور درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔''

نبی کریم ﷺ نے نرم روی کی تاکید کی اور یہ بھی بتادیا ہے کہ سخت گیری اور شدت پسندی سے کام نہیں بنتے۔

عن عائشة (رضی اللّٰه عنها) ان رسول اللّٰه ﷺ قال: ان اللّٰه تعالٰی رفیق۔ یحب الرفق، و یعطی علی الرفق مالا یعطی علی العنف، و مالا یعطی علی ما سواه۔ رواه مسلم و فی روایة له، قال لعائشة: علیک بالرفق و ایاک بالعنف والفحش۔ ان الرفق لا یکون فی شیء الا زانه ولا ینزع عن شیء الا شانه''

(الخطیب العمری: مشکوٰة المصابیح۔ کتاب الآداب، حدیث نمبر۔ 5068 طبع و مشق 1961۔ المکتب الاسلامی للطباعة والنشر۔

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نرم خو ہے، نرم خوئی کو پسند کرتا ہے۔ وہ نرم خوئی کے نتیجہ میں وہ کچھ دے دیتا ہے جو شدت پر نہیں دیتا، نہ کسی اور طریقہ پر دیتا ہے۔ یہ حدیث مسلم نے روایت کی ہے، اور انھوں نے ایک روایت یہ بھی کی ہے کہ (حضور ﷺ نے) عائشہ سے کہا: نرم روی اختیار کرو اور تشدد سے اور فحش سے گریز کرو۔ نرمی جہاں پائی جائے اس میں چار چاند لگا دیتی ہے اور جہاں نرمی مفقود ہوا سے عیب لگ جاتا ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ اقدامی طور پر تشدد کا راستہ اختیار کرنے سے منع کرنے کے ساتھ جوابی طور پر تشدد کی بھی ہمت شکنی کی گئی ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ o وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ج وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ o

(حٰمٓ السجدہ: ۳۴، ۳۵)

''اور اے نبی نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت بڑھی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔''

اس سے انکار نہیں کہ دین میں تشدد کا بھی موقع و مقام ہے، جیسا کہ دفاع اور سزا کی صورت میں ہے مگر ہماری پوری کوشش ہونی چاہیے کہ تشدد کا استعمال کم سے کم ہو اور عام انسانوں کے سامنے زیادہ تر اسلام کی اصل تصویر ہی آئے جو محبت، شفقت و رحمت اور عفو و درگزر پر مبنی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے ہمارے سامنے ایسے نمونے بھی پیش کیے ہیں جہاں تشدد کے جواب میں تشدد کا طریقہ استعمال کیا جا سکتا تھا مگر نہیں کیا گیا۔

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ م اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ یُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ط قَالَ لَاَقْتُلَنَّکَ ط قَالَ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ o لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْکَ لِاَقْتُلَکَ ج اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ

الْعٰلَمِیْنَo اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِکَ فَتَکُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَo فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَo فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ کَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ ؕ قَالَ یٰوَیْلَتٰٓی اَعَجَزْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَo ۙ مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ ۚ کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا ۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ مَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ کَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِکَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَo

(المائدہ:۲۸-۳۲)

''اور ذرا انہیں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بھی بے کم و کاست سنا دو۔ جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی نہ کی گئی۔ اس نے کہا ''میں تجھے مار ڈالوں گا'' اس نے جواب دیا اللہ تو متقیوں ہی کی نذر قبول کرتا ہے۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے آخر کار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لیے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔ پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تا کہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا ''افسوس مجھ پر، میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا''، اس کے بعد وہ اپنے کیے پر بہت پچھتایا اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔ مگر ان کا حال یہ ہے

کہ ہمارے رسول پے در پے ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات لے کر آئے پھر بھی ان میں
بکثرت لوگ زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔''

ان آیات میں بتایا گیا کہ آدم کے نیک بیٹے نے اپنے دفاع میں بھی قتل کے لیے ہاتھ نہ اٹھایا، نیز یہ کہ کسی کا قتل سزا کے طور پر کب روا ہے اور جو جرم قتل یا فساد فی الارض کا مرتکب نہ ہو اس کی جان لینا کتنا سنگین جرم ہے۔ ان آیات کے فوراً بعد وہ آیت آتی ہے جس میں فساد پھیلانے والوں اور قانون توڑ کر اللہ و رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔

قتال کی اجازت

واضح ہوا کہ تشدد جس سے جانیں ہلاک ہوں صرف ان مخصوص حالات میں کیا جا سکتا ہے جن کی صراحت کر دی گئی ہے۔ اب ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ قرآن کریم میں ایسے تشدد کی جس کے نتیجہ میں انسانی جانیں ہلاک ہوں کب اور کن حالات میں اجازت دی گئی ہے۔

جب تک مسلمان مکہ میں رہے انہیں ایسا تشدد استعمال کرنے کی اجازت نہیں ملی حالاں کہ ان پر مسلسل تشدد کیا جا رہا تھا بعض حالات میں اس تشدد نے انتہائی غیر انسانی شکلیں اختیار کر لی تھیں، اور اس کے نتیجہ میں جان بھی جا چکی تھی جیسا کہ حضرت سمیہؓ کے ساتھ ہوا۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ شروع کے برسوں میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی اور وہ کمزور تھے، تشدد کا جواب تشدد سے کیوں کر دے سکتے تھے۔ مگر سنہ ۶ نبوت کے لگ بھگ بھی جب عمر فاروقؓ اور حمزہؓ بن عبد المطلبؓ جیسے طاقت ور اور با اثر لوگ ایمان لا چکے تھے اور وہ ظالموں سے نبرد آزما ہونے کی اجازت بھی طلب کر رہے تھے، مسلمانوں کو تشدد کے جواب میں تشدد کی اجازت نہیں ملی بلکہ بڑھتے ہوئے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے حبشہ کی طرف ہجرت کا مشورہ دیا گیا۔ چناں چہ سو ۱۰۰ سے زیادہ مسلمان حبشہ میں جا بسے۔(۱)

مسلمانوں کو تشدد کے استعمال اور حملہ آوروں کو قتل کرنے کی اجازت مدینہ آنے کے بعد ملی جب نبی اکرم ﷺ کے سربراہی میں ایک ایسی ریاست وجود میں آ چکی تھی جس میں اللہ

(۱) حبشہ کی طرف پہلی ہجرت سنہ ۵ نبوت میں رجب کے مہینہ میں تھوڑے سے افراد نے کی تھی جو چند ماہ بعد یہ افواہ سن کر واپس آ گئے کہ اہل مکہ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ پھر ان افراد سمیت ۱۱۲ افراد سنہ ۶ نبوت میں حبشہ ہجرت کر گئے اور نبی اکرم ﷺ کے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد رفتہ رفتہ وہاں واپس آتے رہے۔

رسولؐ کا حکم چلتا تھا۔ جب وہاں بھی انہیں چین سے نہ رہنے دیا گیا، ان پر حملہ کیا گیا اور جو مسلمان کسی مجبوری یا کمزوری کی وجہ سے مکہ سے ہجرت نہ کر سکے تھے ان کو بھی ستانے کا سلسلہ جاری رہا تو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں ان کو جنگ کرنے کی اجازت دی کہ چوں کہ تم کو مارا جا رہا ہے لہٰذا تم بھی مارو۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۙ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ (الحج:۳۹)

''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے۔ کیوں کہ وہ مظلوم ہیں۔ اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔''

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۝ (البقرہ:۱۹۰)

''اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

یہ جنگ جس کی مسلمانوں کو اجازت دی گئی تھی کوئی اقدامی جنگ نہیں تھی جس میں دوسرے علاقوں پر اس لیے حملہ کیا گیا ہو کہ ان کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا جائے۔ یہ دفاعی جنگ تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ حملہ آور پسپا ہو کر آئندہ حملہ سے باز آ جائے۔ حملہ آور نہ صرف مسلمانوں کی پر امن پناہ گاہ، مدینہ کی اسلامی ریاست، پر چڑھ آئے تھے بلکہ جہاں موقع ملتا تھا انسانوں کو اسلام کی دعوت قبول کرنے کے ان کے بنیادی انسانی حق سے جبر و اکراہ اور تشدد کے ذریعہ محروم رکھنے پر تلے ہوئے تھے اس لیے مسلمانوں کی جنگ کا ایک مقصد یہ بھی قرار پایا کہ ''فتنہ'' ختم ہو جائے اور اللہ کی اطاعت ہر اس انسان کے لیے ممکن ہو جائے جو اللہ کے دین کو قبول کرنا چاہے۔

وَ قٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ ؕ فَاِنِ انْتَھَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ۝ (البقرہ:۱۹۳)

''تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا کسی پر دست درازی روا نہیں۔''

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا (النساء:۷۵)

''آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی مددگار پیدا کر دے۔''

جیسا کہ قرآن کریم میں صراحت ہے، اللہ تعالیٰ نے زندگی اور موت کا سلسلہ جاری کر کے انسانوں کو آزمانا چاہا ہے کہ کون نیکی کی راہ چلتا ہے اور کون بدی کی:

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ (الملک:۲)

''جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔''

''فتنہ'' اس ماحول کو بدل دیتا ہے جس میں یہ آزمائش عمل میں آ سکے کیوں کہ کچھ ظالم انسانوں کو زبردستی کسی راہ کے اختیار کرنے سے روکنے لگتے ہیں۔ اسلامی جہاد جہاں مسلمانوں کی جان و مال اور ان کے زیرنگیں علاقوں کو حملہ آوروں سے بچائے رکھنے کے لیے ہے وہیں ان لوگوں سے جبر و اکراہ ہٹانے کے لیے بھی ہے جن کو ان کے اس ابتدائی حق اختیار سے محروم کیا جا رہا ہو جس کا اوپر نقل کی گئی آیت میں ذکر ہے۔ اسلامی جہاد کا ایک مقصد عام انسانوں کی آزادی اختیار کی بحالی ہے۔

تشدد کا استعمال جرائم کی سزا کے طور پر ہو یا اسلام اور مسلمانوں کی بقاء و تحفظ اور انسانی حق اختیار کی بحالی کے لیے، قتال اور تشدد اسی حد تک روا ہے جتنا اس کام کے لیے ضروری ہو ورنہ وہ عدوان یا اعتداء کی تعریف میں آ جائے گا جس سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔

دفاعی جنگ اور جرائم کی سزا، جن میں محاربہ جیسے سخت جرم کی سخت ترین سزائیں بھی

شامل ہیں، ان دو شکلوں کے علاوہ کسی شکل میں تشدد کا استعمال، بالخصوص ایسا تشدد جو جان لینے کی شکل اختیار کر لے، جائز نہیں۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (الانعام:۱۵۱)

''اے نبیؐ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں۔ یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے، اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی، اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔ یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے توقع ہے کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لوگے۔''

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل:۳۳)

''قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبہ کا حق عطا کیا ہے پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے۔ اس کی مدد کی جائے گی۔''

اوپر نقل کی گئی آخری آیت نے تشدد کے بدلے تشدد کی راہ کھولی ہے، مگر نہ تو اسے لازمی قرار دیا ہے نہ کسی کو اس بات کا اختیار دیا ہے کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ جیسا کہ قصاص کے احکام کے مطالعہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے، اور جس بات کی طرف خود اس آیت (بنی اسرائیل آیت ۳۳) میں اشارہ پایا جاتا ہے، قتل عمد کے قصاص میں قاتل کو سزائے قتل دینا اسلامی ریاست کا کام ہے، مقتول کے اولیاء یا ورثا یہ اقدام بطور خود نہیں کر سکتے۔ ایک عام پالیسی کے طور پر اسلام کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ تشدد کا جواب تشدد سے دینے کی ہمت افزائی کرے۔ بلکہ وہ

اسے بہتر سمجھتا ہے کہ آئندہ تشدد کے سد باب کی تدابیر اختیار کی جائیں اور جو کچھ ہو گیا اس کے سلسلہ میں عفو و درگزر سے کام لیا جائے۔

وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ؕ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَى الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (الشوریٰ: ۴۰-۴۳)

''برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں، ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔''

یہاں آدم کے نیک بیٹے کا رویہ یاد رکھنا چاہیے جو سورۂ بقرہ کی آیات ۲۸ تا ۳۲ کے ذریعہ ہمارے سامنے آچکا ہے۔ خدا کو ہمیشہ یاد رکھنے والے تقویٰ شعار مومن بندوں کے لیے، تشدد کے جواب میں تشدد کی اجازت تو ہے مگر اسلام کے سامنے کچھ اعلیٰ مقاصد بھی ہیں جن کا تقاضا کچھ اور ہو سکتا ہے یہی نکتہ ہے جو بقرہ آیات ۲۸ تا ۳۲ اور سورۂ شوریٰ آیات ۴۰ تا ۴۳ پر غور و فکر چاہتا ہے۔ بات صرف اتنی نہیں کہ ہم پر جو تشدد ہوا اور ہو رہا ہے اس کے جواب میں تشدد کا طریقہ اختیار کرنا ہمارے لیے جائز ہوگا۔ یہ بات بھی سامنے رکھنے کی ہے کہ ایسا کرنے سے ہمارے دعوتی کام کو، اور شہادت علی الناس کے مشن کو مدد ملے گی یا اسے صدمہ پہنچے گا۔

سورۂ شوریٰ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی۔ اس کا زمانۂ نزول حضرت حمزہؓ کے ایمان لانے کے بعد اور حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے پہلے قرار دیا گیا ہے۔(۱) اس زمانہ میں مسلمانوں پر بہت ظلم و ستم ڈھائے جا رہے تھے۔ اس کے باوجود ان کو جوابی تشدد کی اجازت نہیں ملی جیسا کہ

(۱) سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ: تفہیم القرآن: مقدمہ تفسیر سورۂ حٰمٓ السجدہ اور سورۂ شوریٰ۔

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ جوابی تشدد یعنی دفاعی جنگ کی اجازت اس وقت ملی جب مدینہ کی سرزمین پر مسلمان ایک بااقتدار ہیئت کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ جب تک ایسا نہ ہو جوابی تشدد ان انسانی اخلاقی حدود کا پابند نہیں رہ سکتا جن کا اسلام اسے پابند دیکھنا چاہتا ہے۔

تشدد اور دہشت گردی

جب کچھ افراد یا کوئی گروہ جو خود بااقتدار نہ ہو بلکہ کسی دوسری بااقتدار ہیئت کے دائرہ اختیار میں رہتا ہو جوابی تشدد کا طریقہ اختیار کریں گے تو جلد یا بدیر ان کا تشدد ایسی شکلیں اختیار کر لے گا جنھیں آج ہم دہشت گردی کا نام دیتے ہیں محارب اور غیر محارب کی تمیز کے بغیر مقابل کی جان لینا، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، معذور لوگوں کو بھی نہ بخشنا، مال و املاک کا تلف کرنا، جان لینے کے غیر انسانی طریقے اختیار کرنا مثلاً آگ سے جلا کر مارنا، جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا، وغیرہ۔ جیسا کہ ہم اگلی سطروں میں یاد دلائیں گے، اسلام میں ان کاموں کو صراحت کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔

اب موجودہ صورت حال پر نظر ڈالیے۔ ایک طرف وہ قومی ریاستیں (Nation States) ہیں جو اب قومی وسائل سے کام لے کر بڑی بڑی فوجیں رکھتی ہیں، جدید ترین آلات حرب سے لیس ہیں اور بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری کے سارے وسائل رکھتی ہیں۔ دوسری طرف افراد یا گروہ جو حکومت کی اجازت کے بغیر معمولی اسلحے بھی نہیں حاصل کر سکتے، کجا یہ کہ آلات حرب حاصل کر سکیں۔ ان افراد یا گروہوں کے لیے فوج رکھنا ممکن نہیں۔ یہ کھلے عام کوئی والنٹیر ملیشیا بھی نہیں منظم کر سکتے۔ جب بھی یہ اپنی ملکی حکومت کے خلاف یا اپنے ملک میں رہتے ہوئے کسی دوسرے ملک کی حکومت کے خلاف تشدد استعمال کرنے کا فیصلہ کریں گے ان کو خفیہ عمل کا طریقہ اختیار کرنا ہوگا، اپنے مخالفین پر حملہ کرنے میں وہ ان آداب کی پابندی نہیں کر سکتے جن کا اسلام پابند بناتا ہے کیوں کہ وہ نہ تو خود سے اپنا میدان جنگ منتخب کر سکتے ہیں نہ لڑائی کا زمانہ۔ وہ مجبور ہیں کہ خفیہ تیاری کریں اور جب جہاں جو موقع مل جائے اس کو دشمن کو صدمہ پہنچانے کے لیے استعمال کریں۔ وہ جنگی جہازوں تک نہیں پہنچ سکتے اس لیے مسافر بردار جہازوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ فوجیوں اور باوردی محاربین ان کی دسترس سے باہر ہیں اس لیے عام شہریوں کی جان لیتے ہیں۔ اپنے دشمن کی فوجی تنصیبات کے قریب نہیں پھٹک سکتے اس لیے تجارتی مراکز پہ حملہ کرتے

ہیں، وغیرہ۔ اس جوابی تشدد کی ''تنظیم'' اُس تنظیم سے بہت مختلف اور محدود تر ہوتی ہے جو با اقتدار ریاستوں کی قیادت میں عمل میں آتی ہے کیوں کہ بے اقتدار گروہ کے خفیہ عمل کے نصیب میں تھوڑی ہی تنظیم آسکتی ہے اور بس۔ دنیا میں خفیہ تنظیموں کی تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے کہ وہ زیادہ عرصہ تک ایک قیادت کے تحت نہیں رہتیں اور نہ کسی قیادت کی گرفت میدان عمل کی کاروائیوں پر اتنی مضبوط ہوتی ہے جیسے کہ ان کے مقابل منظم ریاستی فوجوں کی ہوتی ہیں۔ ہر کام کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں افراد اور گروہوں کی طرف سے (ریاستی تشدد اور دہشت گردی کے) جواب میں تشدد کی مجبوری یہ ہے کہ وہ لازماً دہشت گردی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ اہم ہے کہ ایسی صورت میں یہ افراد اور گروہ اگر تشدد کا راستہ ترک کر دیں تو پھر کریں کیا۔ اپنا دفاع کیسے کریں اپنے مقاصد کیسے حاصل کریں۔ مگر اس سے پہلے اس نکتہ پر اطمینان کر لیں کہ دہشت گردی کی اجازت نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا اسلام اپنے اعلیٰ انسانی اور اخلاقی مقاصد کے پیش نظر جوابی تشدد کو کچھ آداب کا پابند بناتا ہے ان پابندیوں کا ایک مستند بیان درج ذیل ہے۔

''حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب شام کی طرف فوجیں روانہ کیں تو ان کے سپہ سالار یزید بن ابی سفیان کو ہدایت فرمائی کہ میں تمہیں دس باتوں کی تلقین کرتا ہوں۔ کسی عورت، بچے یا بہت بوڑھے آدمی کو قتل نہ کرنا۔ کسی پھل دار درخت کو نہ کاٹنا، کسی آباد زمین کو ویران نہ کرنا، کسی بکری یا اونٹ کو بجز غذائی ضرورت کے نہ ذبح کرنا، شہد کی مکھیوں کو نہ تو جلانا نہ انھیں منتشر کرنا۔ مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا اور (لڑائی میں) بزدلی نہ دکھانا۔''

(موطا امام مالک۔ کتاب احکام الخلافۃ۔ باب النہی عن الغلول والغدر۔ ملاحظہ ہو مقالہ نگار کی کتاب ''اسلام کا نظریۂ ملکیت''، طبع دہلی، ۱۹۹۴ء صفحہ ۲۱۹)

مال و املاک کی بربادی، عمارتوں کو مسمار کرنا، کھیتوں کو تباہ کرنا..... یہ سب کچھ فساد فی الارض کی تعریف میں آتا ہے جس سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں آیا ہے۔

وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۝

(اعراف:۸۵)

''اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا اس نے کہا اے برادران قوم اللہ کی بندگی کرو لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور زمین میں فساد نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر تم واقعی مومن ہو۔''

وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ (البقرہ:۲۰۵)

''اور جب وہ لوٹ کر جاتا ہے تو زمین میں اس لیے دوڑ دھوپ کرتا ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے۔ حالاں کہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔''

گزشتہ بیس برسوں میں دنیا کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی طرف سے اپنی حکومتوں کے خلاف یا امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس..... کسی بیرونی طاقت کے خلاف ان کی جارحیت یا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کی پالیسیوں، یا ان کے کھلے تشدد کے جواب میں اختیار کیا جانے والا تشدد کا راستہ بھی انھی خارزاروں سے گزرا ہے جن میں قدم رکھنے سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے۔ خاص طور پر گزشتہ چند برسوں میں امریکہ کے خلاف کیے جانے والے تشدد میں انڈونیشیا، فلپین، یمن، افریقہ، مصر، مراقش، سعودی عرب اور خود امریکہ میں کی جانے والی کاروائیوں میں معصوم جانیں ہلاک ہوئی ہیں اور شہری تنصیبات مسمار ہوئی ہیں۔

اس سے بہت چھوٹے پیمانہ پر اور بہت کم تعداد میں خود ہمارے ملک ہندوستان میں بھی جوابی تشدد نے اکثر دہشت گردی کی شکل اختیار کر لی۔ یہ کارروائیاں تشدد کے استعمال کے بارے میں اسلام کی مقرر کردہ حدود سے صریح تجاوز پر مبنی تھیں۔ یہ تشدد نہ تو دفاع کی تعریف میں آتا ہے نہ ازالۂ فتنہ کے لیے کیا جاتا ہے نہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ وہ سزائے جرم ہے جو کوئی با اختیار حاکم کسی مجرم کو دیتا ہے۔ مزید برآں مسلمانوں کی طرف سے حالیہ جوابی تشدد نے عملاً جو شکلیں اختیار کی ہیں وہ سب کے سب تشدد کے استعمال کی اسلامی حدود کی خلاف ورزی کرتی ہیں۔

سفارت خانوں پر حملے، مسافر بردار ہوائی جہازوں کا اغوا، سیر و سیاحت کے لیے آئے

ہوئے افراد کی بسوں پر حملے .....ان میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور غیر متعلق اہل کاروں کی جانیں تلف ہوئیں اور کثیر مقدار میں مال واملاک ہلاک ہوئے۔ یہ بات خود ان کاروائیوں کے ناقابل قبول ہونے کے لیے کافی ہے۔ ان کاروائیوں سے کچھ حاصل ہوا کہ نہیں، اس کا ذکر ہم آئندہ سطروں میں کریں گے لیکن ان سے دنیا کے عام انسانوں کی نظر میں اسلام کی تصویر ضرور بگڑتی جارہی ہے۔ وہ دین جو اصلاح، رحمت وشفقت اور انسان دوستی کا دین ہے اور حالت جنگ میں بھی انسانی جان و مال کا احترام ملحوظ رکھتا ہے اس کے نام پر بے رحمی سنگ دلی اور ہر طرح کی اخلاقی حدود سے تجاوز پر مبنی کاروائیاں کی جارہی ہیں جن کو میڈیا اچھالتا ہے اور ان کے ذریعہ عام انسانوں کے دل و دماغ میں اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے خطرہ، خوف اور بالآخر نفرت کے جذبات پیدا کررہا ہے۔ ایک داعی جماعت کے لیے جو اپنا مشن شہادت علی الناس قرار دیتی ہو اس سے بڑا نقصان کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

موجودہ صورتِ حال میں تشدد

تشدد اور جوابی تشدد کے بارے میں اسلام کے اصولی موقف کے بیان کے بعد اب ہم بعض مخصوص حالات کی نسبت سے یہ جاننا چاہیں گے کہ ان میں تشدد اختیار کیا جاسکتا ہے کہ نہیں۔ ہمارے سامنے چار مخصوص حالات ہیں۔ مسلم اکثریت کے ممالک میں اسلامی حلقوں پر حکومت کی جانب سے کیا جانے والا ظلم وستم، وہ آزاد مسلم علاقے جن کو طاقت کے ذریعہ کسی غیر مسلم علاقہ میں ضم کرلیا گیا ہے اور تشدد کے ذریعہ قابو میں رکھا جارہا ہے، غیر مسلم اکثریت کے جمہوری ممالک میں بسنے والی مسلمان اقلیتوں میں سے بعض جن کو جارحیت کا ہدف بنایا جارہا ہے اور آخر میں، امریکہ اور اس کے حلیف ممالک کی طرف سے کیا جانے والا حالیہ تشدد جس کا نشانہ بعض مسلمان ملکوں، گروہوں اور افراد کو بنایا جارہا ہے۔

۱- پہلی صورت حال کی نمایاں ترین مثال مصر ہے۔ ۱۹۵۴ء سے مصر میں الاخوان المسلمون کے خلاف مظالم کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ کسی نہ کسی شکل میں برابر جاری رہا۔ اس عرصہ میں بہت کچھ ہوا جس کا جائزہ لینا یہاں ممکن نہیں ہے۔ اور مصر کا نمونہ بہت سے عرب ممالک میں دہرایا جاتا رہا۔ صحیح رائے یہ ہے کہ کسی مسلمان ملک میں اسلامی حلقوں کے خلاف حکومتی تشدد کا جواب تشدد سے نہیں دیا جانا چاہیے بلکہ پرامن طریقہ سے انسانی حقوق کی بحالی اور عدل وانصاف کے

قیام کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔ چوں کہ اس موقف کے حق میں دلائل پیش کیے جا چکے ہیں اس لیے اس مقالہ میں، جس کا اصل مرکز توجہ مذکورہ بالا چوتھی صورت حال ہے، ہم تفصیلات میں جانے سے گریز کریں گے(۱)

۲- دوسرا مسئلہ ان آزاد مسلم علاقوں کا ہے جن کو کسی وقت غیر مسلم طاقت نے یک طرفہ کاروائی کے ذریعہ زیر نگیں کرلیا اور اب عالمی رائے عامہ اور مجلس اقوام متحدہ کے دباؤ کے علی الرغم وہاں سے نہیں ہٹتی۔ اس کی سب سے نمایاں مثال فلسطین ہے۔ اسرائیل کے خلاف فلسطینیوں کی لڑائی اس دفاعی جنگ کی تعریف میں شامل ہے جسے ہم نے تشدد کا جائز استعمال قرار دیا ہے جیسا کہ متعلقہ آیات قرآنی کے مطالعہ سے واضح ہے ایسی صورت میں ہر وہ تدبیر اختیار کرنا چاہیے جس سے جارحیت کا خاتمہ ہو اور مسلمانوں کو ان کی زمین واپس ملے۔ اب یہ فیصلہ متعلقہ لوگوں کو کرنا ہے کہ اس مقصد کے لیے کب، کس حد تک، مسلح جہاد کا طریقہ اختیار کریں اور کس حد تک دوسرے ممکن طریقوں پر بھروسہ کریں۔ یہ کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے جس پر اس مقالہ میں بحث ضروری ہو۔

اقلیتی مسلمانوں کا مسئلہ

۳- تیسری صورت حال وہ ہے جو ہمارے ملک ہندوستان میں درپیش ہے اگر کسی غیر مسلم اکثریت کے جمہوری ملک میں وہاں کی مسلمان اقلیت کو تشدد کا نشانہ بنایا جائے اور حکومت ان کی جان و مال کی حفاظت سے قاصر رہے یا جان بوجھ کر کوتاہی برتے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر کبھی کہیں تشدد کرنے والوں کی پشت پناہی کرتی نظر آئے جیسے کہ ۲۰۰۲ء میں گجرات میں ہوا تو مسلمان کیا کریں۔ کیا وہ تشدد کے جواب میں تشدد کر سکتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دوسرے ہندوستانیوں کی طرح مسلمانوں کو بھی اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کے دفاع کا حق حاصل ہے۔ ملکی قانون حملہ آوروں کو روکنے کے لیے ہر ممکن تدابیر اختیار کرنے کی اجازت دیتا ہے چاہے اپنی جان بچانے کی کوشش میں حملہ آور کی جان چلی

---

(۱) ملاحظہ ہو عبد الحمید ابوسلیمان: العنف و ادارۃ الصراع السیاسی بین المبدأ والخیار۔ رویۃ اسلامیۃ، واشنگٹن۔ المعہد العالمی للفکر الاسلامی۔ ۲۰۰۰ء۔ اردو ترجمہ تشدد اور سیاسی کشمکش کے نام سے انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز۔ دہلی سے ۲۰۰۲ میں چھپا ہے۔

جائے۔ لیکن حالات کے دباؤ کے تحت بعض مسلمان اقدامی تشدد کی رائے بھی پیش کرتے ہیں جسے وہ انسدادی تدبیر (Preventive Strike) کا نام دیتے ہیں مگر ہمارے خیال میں یہ درست نہیں ہے کہ:

☆ ایک مقام پر ہندو جارحیت کو روکنے کے لیے ہندوؤں کے حملہ سے پہلے ہی اس مقام پر یا کسی دوسرے مقام پر ہندوؤں پر حملہ کیا جائے۔

☆ یا کسی مقام پر جارحانہ حملہ کے بعد اس کے جواب میں کسی دوسرے مقام پر کسی دوسرے گروہ پر حملہ کیا جائے۔

☆ یا مسلمان اپنے اوپر ہونے والے جارحانہ تشدد کا انتقام لینے کے لیے کسی بھی ہندو فرد یا گروہ کو تشدد کا نشانہ بنانا درست سمجھیں۔

اس طرح سوچنے والوں کی دلیل یہ ہے کہ ایسا کرنے سے حملہ آوروں کو مزید حملوں سے روکا جا سکے گا۔ عام ہندو آبادی مسلمانوں کے انتقامی یا جوابی حملوں کے ڈر سے اپنے جارحیت پسند عناصر کو لگام لگائے گی اور فرقہ پرستانہ عناصر کی حمایت کرنے والی ریاستی حکومتیں یا پولیس افسران بھی مسلمانوں پر جارحانہ حملوں کی روک تھام کرنے لگیں گے۔ بعض لوگ بعض مقامات کے تجربوں کا بھی حوالہ دیتے ہیں جہاں ان کے خیال میں مذکورہ بالا تینوں طریقے جارحیت پر روک لگانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ Deterrence یا انسدادی نظریہ کی توثیق یا تردید کے لیے بڑی چھان بین اور میدانی تحقیق (Empirical Research) کی ضرورت ہے جس کے ذرائع ہمیں نہیں میسر ہیں۔ اس مقالہ میں صرف اس کے اخلاقی پہلو پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے اور افادی پہلو پر رائے ظاہر کی جا سکتی ہے۔

ہمارے خیال میں مذکورہ بالا تین مواقف میں سے تیسرا موقف یعنی انتقامی کاروائی کے طور پر ہندوؤں کے خلاف تشدد کا استعمال اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ معصوم سے مجرم کا انتقام نہیں لیا جا سکتا۔ ایک جمہوری ملک کے شہری ہونے کے ناتے بھی ہم پابند ہیں کہ ایسا نہ کریں۔ اس معاملہ میں ملکی قانون کی صریح خلاف ورزی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ بااقتدار ملکوں کے درمیان جنگ کے اصول ایک ہی ملک میں بسنے والے فرقوں کی باہمی کشمکش پر منطبق نہیں کیے جا سکتے۔ رہا مذکورہ بالا پہلا اور دوسرا موقف تو ہمارے نزدیک وہ بھی اسلامی

تعلیمات کی خلاف ورزی کو مستلزم ہے۔ ایک حملہ آور گروہ کے جواب میں کسی غیر حملہ آور پر امن گروہ پر حملہ نہیں کیا جاسکتا نہ حملہ سے پہلے نہ حملہ کے بعد۔

رہا یہ سوال کہ اگر مسلمان اپنے اوپر کیے جانے والے تشدد کے جواب میں تشدد کا راستہ اختیار کرنے سے گریز کریں تو وہ اس تشدد کو روکنے اور مسلمانوں کے خلاف ہندو جارحیت کے سیلاب پر بند لگانے کے لیے کیا کریں تو مقالہ نگار نے اس کا جواب ایک دوسرے مقالہ میں دیا ہے(۱) کچھ مزید تجاویز آئندہ صفحات میں پیش کی جائیں گی۔

مسلمانوں کے خلاف امریکی جارحیت

۴- امریکہ نے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پنٹاگون پر ہونے والے حملہ کو بنیاد بنا کر پوری دنیا میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اعلان کر رکھا ہے۔ اس مہم میں اس کا اصل ہدف وہ مسلمان افراد اور گروہ ہیں جو امریکہ سے ناراض ہیں، یا اپنے ملک کی حکومت سے ناراض ہیں، یا پوری دنیا میں امریکہ کے بڑھتے ہوئے اثرات کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے خطرہ سمجھ کر امریکہ اور اس کے مفادات کو نقصان پہنچانا طے کر چکے ہیں۔ چوں کہ امریکہ بعض ملکوں کو ایسے افراد اور گروہوں کی سرپرستی کا مجرم گردانتا ہے لہٰذا وہ ملک بھی اس کا ہدف قرار پا چکے ہیں۔ چنانچہ پہلے افغانستان پھر عراق پر حملہ اور قبضہ کے بعد اب امریکہ اور اس کے حلیف ممالک ایران، شام اور بعض دوسرے عرب ممالک پر نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی وہ پاکستان اور جنوبی مشرقی ایشیا کے ممالک سے ایسے افراد کو پکڑنے اور سزا دینے میں مصروف ہیں جو امریکہ کے خلاف دہشت گردی کر چکے ہیں یا کر سکتے ہیں۔ امریکہ کے زیر اثر، اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اس کے شریک کار کے طور پر پاکستان، سعودی عرب اور مصر جیسے ممالک میں حکومتیں اپنے ملک کی اسلامی جماعتوں کے ساتھ پہلے سے زیادہ سختی برت رہی ہیں اور دینی مدارس کے سلسلہ میں ان حکومتوں کا رویہ بدل رہا ہے۔ ان باتوں کی وجہ سے دنیا بھر میں مسلمان امریکہ کی طرف سے سخت اندیشہ ناک ہیں۔ ان کو ڈر ہے کہ جس طرح ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کے قابل مذمت

---

(۱) تحفظ ملت کا مسئلہ جو ''تحریک اسلامی عصر حاضر میں'' نامی کتاب کے صفحات ۹۲-۱۱۰ پر شائع ہوا ہے۔ یہ کتاب دہلی سے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نے ۱۹۹۵ء میں شائع کی ہے۔

مجرمانہ حملوں کی سزا دینے کی آڑ میں امریکہ میں فی الوقت حکمراں ٹولے نے اپنے پہلے سے طے کردہ ایجنڈے کے مطابق پہلے افغانستان پھر عراق پر حملے کیے اسی طرح وہ پوری دنیا میں ان اسلامی حلقوں کو ختم کر دینا چاہتا ہے جن کو وہ اپنے مفادات کے لیے خطرہ سمجھتا ہے۔ امریکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آڑ میں ان رجحانات کو بھی دبا دینا چاہتا ہے جو امریکی تسلط پسندی (Hegemony) کو چیلنج کرتے ہوں اور خاص طور پر، امریکی اباحیت پسندی سے اپنے معاشرہ کو دور رکھنا چاہتے ہوں۔ ان اندیشوں کی تائید میں مسلمان یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ امریکہ کے ایماء پر مصر اور سعودی عرب جیسے ممالک میں دینی تعلیم کی درسی کتابوں پر نظر ثانی کی جارہی ہے اور ائمہ مساجد اور جمعہ کا خطبہ دینے والوں کی تطہیر عمل میں لائی جارہی ہے۔

امریکہ کے ارادوں کے بارے میں اندیشے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ہیں مگر ہندوستانی مسلمان خاص طور پر پریشان ہیں۔ کیوں کہ خود ہندوستان کے اندر جارحانہ ہندوتو کا پرچار کرنے والے بھی کچھ ایسے ہی ارادے رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بھی دینی مدارس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ مساجد کا سروے کرا رہے ہیں، تبلیغی سرگرمیوں پر کڑی نگرانی رکھے ہوئے ہیں اور تبدیلیٔ مذہب کے خلاف قانون لا رہے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اندیشہ ہے کہ جارحیت پسند ہندوتو دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی عالمی مہم کو اپنے مخصوص اسلام دشمن ایجنڈے کی تکمیل کے لیے استعمال کرے گی اور اس کام میں اسے اسرائیل اور اس کی خفیہ ایجنسیوں کا بھی تعاون حاصل رہے گا۔

ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ اس مقالہ میں ان اندیشوں کا معروضی تجزیہ کر سکیں کیوں کہ یہ بحث کافی طویل ہو سکتی ہے۔ امریکہ اور اسلام یا امریکہ اور مسلمانان عالم کے باہمی تعلقات کو صرف حالیہ واقعات کی روشنی میں نہیں سمجھا جا سکتا، نہ ہی ان تعلقات کو امریکہ کے موجودہ حکمراں ٹولہ کے عزائم کا اسیر سمجھنا درست ہوگا۔ امریکہ اور اسلام یا امریکہ اور مسلمانان عالم کے باہمی تعامل کو سمجھنے کے لیے ہمیں مستقبل کے مختلف ممکنہ مناظر (Scenarios) کو سامنے رکھنا ہوگا۔ یہ کام مستقل مقالوں بلکہ کتابوں کا طالب ہے۔ زیر نگاہ مقالہ میں ہمارا مرکز توجہ صرف یہ ہے کہ کیا امریکی تشدد کے جواب میں مسلمانوں کو تشدد کا راستہ اختیار کرنا مناسب ہے۔ باقی رہے مسئلہ کے

دوسرے پہلو جن میں سے صرف چند کا اوپر ذکر کیا جا سکا ہے تو اس سلسلہ میں بعض اچھی تحریریں میسر ہیں جن کا مطالعہ مفید رہے گا۔(۱)

ہمارا موقف یہ ہے کہ موجودہ حالات میں امریکہ کے خلاف تشدد کا استعمال مسلمانوں کے لیے نہ تو جائز ہے نہ مفید بلکہ اس کے برعکس اس سے خود اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ البتہ جب امریکہ کسی مسلمان ملک پر علی ناحق حملہ کرے جیسا کہ اس نے عراق پر کیا تو بے شک مسلمانوں کو اپنے ملک کے دفاع میں لڑنے کا اختیار ہے مگر یہ طریقہ متعلقہ لوگ ہی اختیار کر سکتے ہیں، اور انہی حدود کے اندر رہتے ہوئے کر سکتے ہیں، جو دو با اقتدار ملکوں کے درمیان ہونے والی جنگوں کے سلسلہ میں معروف ہیں، جن کا بیان متعدد بین الاقوامی ضوابط عرفی (Conventions) میں موجود ہے۔ کسی مسلمان ملک کے خلاف امریکی جارحیت کی بنیاد پر عام مسلمانوں کو اس بات کی دعوت دینا کہ جہاں کسی امریکی شہری کو پاؤ اسے مارو اور دنیا میں جہاں بھی امریکی مفادات، تنصیبات یا سفارت خانوں پر حملے کر سکتے ہو کرو، جیسا کہ بعض مسلمان گروہوں نے مبینہ طور پر کہہ رکھا ہے، خلاف اسلام ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ کاروائیاں ان حدود سے متجاوز ہیں جن کے اندر رہ کر ہی تشدد کا استعمال جائز ہو سکتا ہے بلکہ جیسا کہ ہم آئندہ مزید وضاحت کریں گے ان کاروائیوں سے اسلام اور مسلمانوں کو اس سے کہیں زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے جتنا امریکہ کو پہنچا ہے یا پہنچ سکتا ہے۔

تشدد سے مکمل اجتناب ضروری ہے

ہمارے خیال میں امریکہ کے خلاف مسلمانوں کو تشدد کا راستہ نہیں اختیار کرنا چاہیے۔ جن مسلمان افراد اور گروہوں نے یہ راستہ اختیار کر رکھا ہے ان کو ایسا کرنے سے روکنا چاہیے۔ تشدد کا راستہ موجودہ حالات میں اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ہے اس لیے یہ راستہ اختیار کرنے والوں کے ساتھ کسی طرح کا تعاون نہیں کرنا چاہیے۔ نہ ان کی مالی امداد ہونی

---

(۱) ڈاکٹر محمد فاروق خاں: امریکہ کا کردار، ماہنامہ اشراق، لاہور۔
قسط اول جلد ۱۵، شمارہ ۳، مارچ ۲۰۰۳، صفحات ۳۷-۶۱
قسط دوم، جلد ۱۵، شمارہ ۴، اپریل ۲۰۰۳، صفحات ۳۱-۵۵

چاہیے، نہ ان کو افرادی طاقت فراہم کی جانی چاہیے۔ تشدد سے باز رہنے کے بارے میں ہمارا موقف درج ذیل امور پر مبنی ہے۔

☆ موجودہ حالات میں امریکہ کے خلاف مسلمانوں کا تشدد لازماً ایسی شکلیں اختیار کر لیتا ہے جو حرام ہیں اور فساد فی الارض کی تعریف میں آتی ہیں۔ ایسے طریقے کبھی بھی کسی بھی مقصد کے لیے استعمال نہیں کیے جا سکتے۔

☆ امریکہ کے خلاف بعض مسلمان افراد یا گروہوں نے جو پرتشدد کاروائیاں اب تک کی ہیں ان سے اسلام اور مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچتا ہے ایک طرف تو میڈیا نے ان کاروائیوں کو اسلام کی تصویر بگاڑنے اور مسلمانوں کو بے رحم، سنگ دل، انسانی شرف کے تصور سے محروم ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا ہے جس کے نتیجہ میں عام انسانوں میں اسلام سے دوری بڑھی اور دوسری طرف حکمراں ان کاروایوں کو بنیاد بنا کر امریکی عوام اور ان کی نمائندہ مجالس کو دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کے نام پر مسلمانوں کے خلاف جارحیت کے لیے اپنے ساتھ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح یہ پرتشدد کاروائیاں دراصل دائیں بازو کے امریکی عیسائیوں نیز صہیونی اور اسرائیلی لابی کے لیے دلیل فراہم کرنے کا کام کر رہی ہیں۔

☆ مسلمانوں کے پاس ایسی طاقت نہیں ہے کہ وہ امریکی تشدد کا مقابلہ تشدد کے ذریعہ کر سکیں۔ تشدد کے میدان میں امریکہ سے لڑائی اپنی شکست کو دعوت دینا ہے۔ مسلمانوں کی بھلائی اس میں ہے کہ اگر امریکہ سے ٹکراؤ ہونا ہی ہے (جو اس مقالہ نگار کے نزدیک ضروری نہیں ہے) تو نظریات و افکار تہذیب و ثقافت کے میدان میں مقابلہ ہو نہ کہ جنگ کے میدان میں۔

مزید براں یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ امریکہ کے خلاف تشدد کا استعمال سد باب (Deterrence) کا کام کرے گا اور امریکہ کو مسلمانوں کے خلاف تشدد کے مزید استعمال سے روکے گا۔ اب تک کا تجربہ ایسا نہیں ہے اور طاقت کا توازن امریکہ کے حق میں اتنا زیادہ ہے کہ یہ بات ناقابل تصور ہے کہ مسلمانوں کا امریکہ کے خلاف کیا جانے والا تشدد اتنا زبردست اور بااثر ہو جو امریکہ جیسی طاقت کو مسلمانوں کے خلاف مزید تشدد سے روک دے۔

☆ ہم مسلمانوں کو تشدد سے مکمل اجتناب کی دعوت اس لیے بھی دے رہے ہیں کہ تشدد

کا طریقہ اختیار کرنے سے داخلی طور پر مسلم معاشرہ کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ ان کے قیمتی وسائل اور اچھی افرادی طاقت تعلیم و تربیت، میڈیا، سیاست اور معاشی ترقی جیسے تعمیری کاموں میں لگنے کی بجائے خفیہ کاروائیوں، اسلحہ حاصل کرنے اور حملہ کے منصوبے بنانے اور نافذ کرنے میں صرف ہو رہی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں جب کوئی فرد یا گروہ کسی ملک کا شہری ہونے کے ساتھ اس ملک یا کسی دوسرے ملک کے خلاف پرتشدد کاروائیوں کا اہتمام کرتا ہے تو یہ کام لازماً خفیہ انجام دینا پڑتا ہے اور اس میں قدم قدم پر قانون کی خلاف ورزی کرنا پڑتی ہے۔ ایک کھلے معاشرہ میں جیسا کہ ہندوستان، امریکہ اور دوسرے جمہوری یا نیم جمہوری ممالک میں پایا جاتا ہے خفیہ اور خلاف قانون کاموں کے لیے ایک نئی قیادت ابھرتی ہے۔ کسی ملک میں بھی مسلمانوں کی جو دینی اور سیاسی قیادت گزشتہ نصف صدی سے کام کر رہی ہے وہ خفیہ خلاف قانون اسلحہ سازی، اسلحہ حاصل کرنے، اور پرتشدد کاروائیاں کرنے کرانے کا کام نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ان کاموں میں ان لوگوں سے مدد لینا پڑتی ہے جو جانتے ہیں کہ قانون کس طرح توڑا جاتا ہے، اسلحے کس طرح اسمگل کیے جاتے ہیں، فرضی ناموں اور جعلی پاسپورٹوں کے ساتھ کس طرح سفر کیا جاتا ہے، وغیرہ..... جلد یا بدیر ان لوگوں کو بین الاقوامی مجرموں اور اسمگلنگ کے ماہرین کا تعاون بھی حاصل کرنا پڑتا ہے۔ تشدد کی کوئی خفیہ کاروائی ان حدود کے اندر رہ کر نہیں کی جا سکتی جن کا اسلام نے ہمیں پابند بنایا ہے، نہ یہ کاروائی ''صالحین'' کے ذریعہ عمل میں آسکتی ہے۔

یہ داخلی خرابی بڑے دور رس نتائج کی حامل ہے۔ ہم اسے اپنے ملک ہندوستان کی نسبت سے بہت بری بات سمجھتے ہیں کہ ہندو جارحیت سے نبرد آزما ہونے کی خاطر ہم اپنی قیادت اپنے غیر اسلامی کردار رکھنے والے عناصر کے سپرد کریں۔ ہم چاہیں گے کہ اس کے برعکس ہندوستان کی غیر مسلم آبادی سے تعامل میں ہمارے بہترین لوگ آگے ہوں جو اپنے قول و عمل دونوں سے اسلام کی نمائندگی کرنے والے ہوں یہاں تک کہ اگر اپنے دفاع کے لیے ہتھیار اٹھائیں تو بھی اسلامی کردار کے ساتھ اٹھائیں۔ علاوہ اس کے کہ ہم کو ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے امر واقعہ بھی یہ ہے کہ فسادات میں جب مسلمان اخلاقی رویہ اختیار کرتے ہیں، مثلاً بے گناہ،

غیر متعلق غیر مسلم افراد اور گروہوں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں تو ان کے ساتھ بھی ایسا ہی کرنے والے غیر مسلم اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو کمزور مسلمانوں کو پناہ دیتے ہیں اور جارحیت پر آمادہ اپنے مذہب کے لوگوں کو روکتے ہیں۔ موجودہ ہندوستان ہو جہاں ہمیں جارحانہ ہندوتو سے سابقہ ہے یا موجودہ عالمی صورت حال جس میں ہمیں صہیونی۔ دائیں بازو کے عیسائی اور امریکی تسلط پسندی (Hegemony) کے قائل ایک ٹولہ کی قیادت میں امریکی جارحیت سے واسطہ ہے، دونوں میدانوں میں ہمارے اصل ہتھیار ہمارا اخلاق و کردار اور وہ نظریات و اقدار ہیں جن کے ہم امین ہیں، جنہیں پوری انسانیت تک پہنچانے پر ہم مامور ہیں۔ جب ہم کسی وقتی دباؤ کے تحت تشدد کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں تو ہماری اخلاقی حیثیت مجروح ہوتی ہے۔ اور ہمیں اسلام کے انسانی مشن کو کنارے رکھ کر اس سے مغایر کاموں کو اپنانا ہوتا ہے۔

آئندہ لائحۂ عمل

بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تشدد سے مکمل اجتناب اگر ممکن بھی ہو تو صرف ایسا کرنے سے مسلمانوں کی صورت حال نہیں بدل جائے گی۔ ہندوستان ہو یا عالمی سماج، دونوں میں باعزت زندگی کی بحالی کے لیے کچھ اور بھی کرنا ہوگا۔ دوسرے کب تشدد سے باز آئیں گے اس کا فیصلہ ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہے البتہ یہ بات بہت اہم ہے کہ عام انسانوں کے دلوں سے یہ بات نکل جائے کہ اسلام اور مسلمان ان کے لیے خطرہ ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں کچھ ایسا ہی فضا بنا دی گئی ہے جس کو صاف کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا ہوگا۔ ایسا کرنے میں ساری دنیا کے مسلمانوں کو یورپ اور امریکہ کے مسلمان شہریوں اور وہاں مقیم مسلمانوں کی مدد کرنا چاہیے۔ لیکن مسلمان خود اپنے طرز عمل کی اصلاح سے بھی فضا کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ ذیل میں ہم تین ایسی باتوں کا ذکر کریں گے جن کا اہتمام آسانی کے ساتھ اور فوری طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اور جن کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمانوں کی تصویر عام انسانوں کی نظر میں بہتر ہو سکتی ہے۔

شفافیت (Transparency)

اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں اس لیے پھیلائی جا سکی ہیں کہ یورپ اور امریکہ کے تمام انسانوں کو، بلکہ خود ہمارے ملک ہندوستان کے عام غیر مسلموں کو اسلام

اور مسلمانوں کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ مسلمانوں کی ماضی کی تاریخ کے بارے میں صحیح معلومات عام کرنا مشکل کام ہے اور اس میں کافی وقت لگ سکتا ہے، لیکن مسلمانوں کے حال کے بارے میں پیدا کی جانے والی غلط فہمیاں جلد دور کی جاسکتی ہیں۔ مدرسوں میں کیا پڑھایا جاتا ہے؟ مسجدوں کے اندر کیا ہوتا ہے؟ تبلیغی سفر اور دعوتی اجتماعات میں کیا سکھایا جاتا ہے؟ ان کے بارے میں غلط پروپیگنڈے کا جواب یہ ہے کہ جو کچھ ہے سب کے سامنے ہو۔ ہر انسان کے لیے یہ ممکن ہو کہ وہ ان اداروں اور ان جیسے دوسرے اسلامی اداروں اور مسلم سرگرمیوں کا براہ راست مشاہدہ کر سکے۔ یہی نہیں بلکہ امت کی داخلی بہتری اسی میں ہے کہ ان تمام اداروں کے مالیات اور نظم و انصرام (Management) میں بھی شفافیت پائی جائے کوئی ابہام، غموض یا راز داری (Secretivenes) نہ باقی رہے۔ ان اداروں کے مالیات کو خاص طور پر شفاف رکھنا ہوگا تاکہ ہندوتو کے علمبردار یا امریکی تسلط پسند یہ الزام نہ لگا سکیں کہ یہ ادارے مذہب اور تعلیم کے نام پر جو فنڈ جمع کرتے ہیں وہ پرتشدد کاروائیوں کی انجام دہی میں صرف ہوتا ہے۔ خود ہمارے مدارس، مساجد اور خیراتی اسپتالوں وغیرہ فلاحی اداروں کو کرپشن سے بچانے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ ان کی آمد و خرچ کا حساب قاعدہ کے مطابق رکھا جائے، آڈٹ ہو، اور عوام کے معائنہ کے لیے کھلا رہے۔

جمہوریت

جب کسی اسلامی ادارہ میں فیصلہ کا اختیار تمام تر ایک آدمی کے ہاتھوں میں ہو تو اس کے مالیات اور نظم و انصرام میں شفافیت نہیں برقرار رہتی۔ شفافیت کے لیے ضروری ہے کہ اہل معاملہ کے مشورہ سے فیصلے کیے جایا کریں۔ امریکہ اور اس کے جلیفوں کا مسلمان ملکوں اور اداروں کے خلاف یہ الزام ہے کہ یہ غیر جمہوری ہیں۔ ان میں اہم فیصلے متعلقہ لوگوں کے مشورہ سے نہیں طے پاتے۔ ان کے وسائل پر مکمل تصرف کا اختیار ایسے لوگوں کو حاصل ہے جن کو عوام نے اس کام کے لیے نہیں چنا ہے بلکہ انہیں یہ پوزیشن موروثی بادشاہت یا فوجی انقلاب کے ذریعہ ملی ہے۔ اکثر یہی ماڈل مسلمانوں کے دوسرے اداروں میں بھی دہرایا جاتا ہے۔ ان کی جماعتیں ہوں یا

دوسرے دینی ادارے، ایک شخص تاحیات سربراہ رہ کر جب رخصت ہوتا ہے تو اس کی اولاد اس کی جگہ لے لیتی ہے، الا ماشاء اللہ۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ غیر جمہوری طریقہ سے مقام سربراہی پر آئے ہوں وہ فیصلے کرنے میں جمہوری طریق کار کی پابندی نہیں کر سکتے۔ ایسی صورت حال میں اس تصور میں جان آجاتی ہے کہ مسلمان عوام اپنے حکمرانوں کے ہاتھوں میں اور مسلمانوں کے قومی فلاحی وسائل مسلم اداروں کے روایتی سربراہوں کے ہاتھ میں یرغمال ہیں، ان کو آزاد کرانے کی ضرورت ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جس صفت کو قرآن حکیم نے مسلمانوں کا مزاج بتایا ہے، بمصداق آیت کریمہ:

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (الشوریٰ:۳۸)

''جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں اور ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

اسی صفت شورائیت کے فقدان کو بنیاد بنا کر مسلمان ملکوں اور اداروں پر حملے کیے جارہے ہیں!

جس طرح شفافیت کا اہتمام خود مسلمانوں کو فائدہ پہنچائے گا اور ان کے ادارے زیادہ کارکردگی کے ساتھ چلنے لگیں گے، اسی طرح شورائی طریقۂ فیصلہ اختیار کرنے سے بھی ان اداروں کی کارکردگی بہتر ہوگی اور ان کو بیش از بیش عوامی تعاون حاصل ہوگا۔ مسلمان جماعتوں اور دینی اداروں میں اگر ہر سطح پر متعلقہ افراد سے مشورہ کرنے اور فیصلہ میں ان کی رایوں کو ملحوظ رکھنے کا طریقہ اختیار کیا جائے تو ان اداروں کی مصداقیت (Credibility) میں اضافہ ہوگا۔ آج صورت حال اس سے مختلف ہے جس کی وجہ سے ایک طرف تو ان اداروں کو تمام مسلمانوں کا خوش دلانہ تعاون نہیں حاصل ہوتا دوسری طرف وہ ہندوستان میں ہندوتو کے حاملین اور بین الاقوامی سطح پر امریکہ اور اس کے حاشیہ برداروں کو اس بات کا موقع فراہم کرتے ہیں کہ ان

اداروں کی طرف ایسے عزائم، سرگرمیاں اور خیالات منسوب کریں جو حقیقت سے دور ہیں۔ غیر نمائندہ قیادتوں کی نگرانی میں چلائے جانے والے فلاحی خیراتی اداروں، مدرسوں اور دوسری تعلیم گاہوں، اور جماعتوں کی طرف انسانیت دشمن رجحانات، عدم رواداری کا سلوک اور پرتشدد عزائم منسوب کرنا آسان ہے۔ چوں کہ مسلمانوں کے ملک، جماعتیں، تعلیم گاہیں اور دوسرے ادارے دنیا بھر میں معروف جمہوری طریقوں سے نہیں چلائے جاتے اس سے وہ شک و شبہ کا ہدف آسانی سے بن جاتے ہیں۔ اگر مسلمان اپنی تمام سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں میں شفافیت کے ساتھ جمہوری کلچر۔ اظہار رائے کی آزادی، اختلاف رائے کا احترام، فیصلہ میں سب کی رائے کی رعایت ملحوظ رکھنا۔ اختیار کرلیں تو غیروں کے لیے ان کو سمجھنا آسان ہوجائے گا۔ وہ یہ جان سکیں گے کہ کب ان سے کیا کرنے کی توقع کی جاسکتی ہے اس طرح وہ خوف وخطر زائل ہوجائے گا جو آج کل ایک بند کتاب ہونے کی وجہ سے دوسروں میں ان کی طرف سے پایا جاتا ہے یا پیدا کرادیا گیا ہے۔

عام انسانوں میں نفوذ

اصلاح امت اور ملّی اٹھان کے کسی بھی جامع منصوبہ پر عمل درآمد کی تمہید کے طور پر شفافیت اور جمہوریت کے ساتھ جس تیسری خصلت کی ضرورت ہے وہ ہے عام انسانوں سے میل ملاپ بڑھانا ان کے دکھ درد میں شریک ہونا اور حتی الامکان مسلمانوں کے مسائل کو بھی عام انسانوں کے مسائل کے طور پر حل کرنے کی کوشش کرنا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان ہو یا عالمی سماج مخصوص ''مسلم مسائل'' کی فہرست بہت محدود ہے۔ زیادہ تر ہمیں وہ مشکلات و مسائل درپیش ہیں جو دوسرے انسانوں کو بھی درپیش ہیں: غربت، مرض، مناسب مکان اور حفظان صحت کے بنیادی اہتمام سے محرومی، ناخواندگی، عدم تحفظ (Insecurity)، بے چینی جس میں بڑا دخل مستقبل کے غیر یقینی حالات کا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن سے آج ہندوستان کے اکثر لوگ اور جنوبی مشرقی ایشیا اور افریقہ کی بیشتر انسان دوچار ہیں۔ مسلمانوں پر کچھ زیادہ آفت ہے۔ ان مسائل کے حل کی وہ کوششیں زیادہ موثر ہوں گی جو مسلمان اپنے پڑوسیوں اور اہل ملک کے ساتھ

مل کر کریں، یا انکی طرف سے کی جانے والی کوششوں میں شریک ہو کر کریں۔ مسلمان اپنی الگ دنیا نہیں بساتے بلکہ دنیا بھر کو اپنا وطن سمجھ کر اس کے سدھار اور ترقی کی کوشش کرتے ہیں۔ موجودہ صورت حال میں، جس کا ایک اہم عنصر ہے عام انسانوں میں مسلمانوں کی طرف سے شک وشبہ اور بے اعتمادی، اس انداز کار کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کی کوئی (Neighborhood) آبادی ہو یا ہندوستان کا کوئی محلّہ، ایک دوسرے کی طرف سے شک وشبہ اور خطرناک اندیشوں کی فضا ختم کرنا اور مسلمانوں اور غیر مسلم انسانوں میں باہمی اعتماد بحال کرنا بہت اہم ہے۔ تشدد ایک مظہر ہے جس کی جڑیں اس اندیشہ ناک فضا میں پائی جاتی ہیں۔ تشدد کے ازالہ کے لیے اس فضا کو درست کرنا ضروری ہے۔

آج کل اس بات کا بڑا رواج ہے کہ سماجی خدمت اور فلاحی سرگرمیوں کے لیے ایسی تنظیمیں قائم کی جائیں جو حکومت کے تابع نہ ہوں۔ یہ غیر حکومتی تنظیمیں (NGOs) اکثر اوقات کئی ملکوں میں ایک ساتھ کام کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض تنظیموں نے بین الاقوامی طور اتنا وزن حاصل کر لیا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی ملک ان کو آزادانہ عمل کے مواقع فراہم کرنے پر مجبور ہے۔ ان میں سے بعض تنظیموں کو مجلس اقوام متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی اداروں میں بھی نمائندگی ملتی ہے۔ ماحول کو کثافت سے بچانا۔ امن عالم، انسانی حقوق کی پاسداری، غربت، مرض اور ناخواندگی کا ازالہ، عورتوں کو سماج میں باعزت مقام دلوانا، لوگوں کو بندھوا مزدوری سے آزاد کرانا، بچوں کی مزدوری کا رواج ختم کرنا، خود کار لوگوں کو کریڈٹ کی فراہمی، ہرے بھرے جنگلات کو کاٹے جانے سے بچانا، انہی (NGOs) کے ذریعہ انجام پا رہے ہیں، ہمارے دین کا مزاج ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم ان کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، مزید براں موجودہ شبہوں سے بھری فضا کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے غیر مسلم بھائیوں سے ہاتھ ملانے اور ان کے دوش بدوش کھڑے ہونے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اسلامی مالیاتی ادارے (Islamic Financial Institutions) اپنا دروازہ تمام انسانوں کے لیے کھلا رکھتے ہیں اور بالفعل کچھ غیر مسلم افراد بھی اسلامی بنکوں اور دوسرے

مالیاتی اداروں سے وابستہ ہیں، کوشش کرنا چاہیے کہ اس وابستگی میں وسعت اور گہرائی پیدا ہو اور یہی ماڈل دوسرے اسلامی اداروں میں بھی دہرایا جائے۔

حرف آخر

تشدد سے دست کشی مسلمانوں کے جملہ مسائل کا حل نہیں ہے مگر ایسا کرنے سے بہت سے ان مسائل سے چھٹکارہ ضرور حاصل ہو جائے گا جو مسلمانوں میں تشدد یا جوابی اور انتقامی تشدد کے رجحان سے پیدا ہو رہے ہیں۔ رہی یہ بات کہ ہمارا موجودہ زوال عروج سے کب بدلے گا اور ہماری وہ کمزوریاں کیوں کر دور ہوں گی جن کی وجہ سے ہم ترقی نہیں کر پا رہے ہیں تو اس پر عرصہ سے بحث ہو رہی ہے۔ اور اس سلسلہ میں تعلیم و تربیت، صحت، معاش، سیاست وغیرہ مختلف میدانوں میں بہت سی کوششیں بھی کی جا رہی ہیں لیکن یہ کام لمبی مدّت چاہتا ہے اسے صبر کے ساتھ کیے جانا ہوگا۔ عارضی حالات سے متاثر ہو کر تشدد کا راستہ اختیار کرنا بے صبری کی علامت ہے اور بے حکمتی کا مظہر۔ اس مقالہ میں ہماری کوشش رہی ہے کہ امت مسلمہ اور ملت اسلامیہ ہند کو اس وقتی لغزش پا سے بچا کر ایک بار پھر صبر و حکمت کے ساتھ اپنی اصل راہ پر گامزن ہونے کی دعوت دیں۔

اسلامی ترجیحات

مسلمانوں کی بھلائی اور اسلام کی سربلندی کے لیے کرنے کے چند کام

نئی صدی کی آمد نے لوگوں کو جن مسئلوں پر از سرِ نو سوچنے پر آمادہ کر دیا ہے، ان میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل بھی شامل ہے، گزشتہ برسوں اسلامی دنیا کچھ ایسے تجربات سے گزری ہے کہ نئی صدی کا آغاز قریب نہ ہوتا تو بھی حالات کا جائزہ لے کر آئندہ کرنے کے کاموں پر سوچنا ضروری تھا۔ مسلمان معاشرہ کے دوسرے باشعور عناصر کے ساتھ اسلامی تحریکیں بھی غور و فکر کے اس عمل میں شریک ہیں۔ پوری دنیا میں اسلامی تحریکیں اپنی ترجیحات پر دوبارہ غور کر رہی ہیں۔ (۱)

جو ترجیحات اس صدی کی دوسری اور تیسری دہائیوں میں متعین کی گئی تھیں، ساٹھ سال کے تجربے کے بعد ان پر اس خیال سے نظر ڈالی جا رہی ہے کہ اگلی صدی کے لیے رہنمائی حاصل کی جا سکے۔ بیسویں صدی میں ابھرنے والی اسلامی تحریکوں کے بانیوں کی جگہ جن لوگوں نے قیادت سنبھالی تھی، اب وہ ایک نئی نسل کو باگ ڈور سونپ رہے ہیں۔ اس نئی نسل کو ان تبدیلیوں کا زیادہ گہرا شعور ہے جو گزشتہ دس بیس برسوں میں بڑی تیزی سے آئی ہیں۔ کوئی ملک، کوئی گروہ یہاں تک کہ کوئی فرد ان تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ ان تبدیلیوں کا اور ان کے زیر اثر نئے غور و فکر کا جائزہ لینا ایک مستقل کام ہے، جو اس مضمون میں نہیں کیا جا سکتا۔ پوری دنیا کے سیاق میں اسلامی ترجیحات پر ابتدائی اظہار خیال راقم الحروف نے انگریزی میں شائع ہونے والے ایک رسالے میں کیا ہے۔ (۲) یہاں ہم صرف ایک اہم کام، معاشی قوت حاصل کرنے کی

ضرورت پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ جو باتیں کہی جائیں گی ان کا تعلق عمومی طور پر تو پوری دنیا کے مسلمانوں سے ہے مگر مسلمان اقلیتوں کے لیے یہ باتیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ عملی تجاویز پیش کرتے وقت ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوستان میں اسلامی تحریک کو سامنے رکھا گیا ہے۔

معاش کی اہمیت

پوری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان بن کر رہنے اور انسانوں کے سامنے اسلام کی قولی و عملی شہادت دینے اور بالآخر دنیا میں اسلام کا بول بالا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان افراد، مسلمان گروہ اور مسلمان ملک اپنی معاشی حالت بہتر بنائیں اور معاشی مضبوطی حاصل کریں۔ اسلامی تحریکوں کو اپنے افراد کی تربیت اور مسلمانوں کو اسلام پر زیادہ سے زیادہ کاربند ہونے کی تلقین میں اس مقصد کو غیر معمولی اہمیت دینی چاہیے۔ کیوں کہ ان کے مقصد، سیاسی و معاشی نظام سمیت انسانی معاشرہ کی اسلامی تشکیل نو، کے حصول کے لیے معاشی قوت ناگزیر ہے۔

یہ درست ہے کہ اسلامی زندگی گزارنے اور اسلامی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے معاشی حالت کو بہتر بنانا کافی نہیں ہے۔ صرف معاشی خوش حالی نہ تو فرد کو بہتر مسلمان بناتی ہے نہ گروہوں اور ملکوں کو اسلامی مقاصد کا خادم بناتی ہے۔ مگر سارے نیک ارادوں کے باوجود معاشی حالت کو بہتر بنائے بغیر موجودہ حالات میں افراد، گروہوں یا ملکوں کے لیے نہ تو اسلامی زندگی گزارنا ممکن ہے نہ اسلامی مقاصد کا حصول۔

اس حقیقت کا تقاضا ہے کہ اسلامی تحریکوں کے پروگرام میں ذیل کے چار کاموں کو اولیت حاصل ہو اور ان کی افرادی طاقت اور مالی وسائل کا قابل لحاظ حصہ ان چاروں کاموں کو گھر گھر، گاؤں گاؤں، شہر شہر اور ہر ملک میں کر دکھانے میں لگا دیا جائے۔

عملی پروگرام

اولین اہمیت کے حامل یہ چار کام درج ذیل ہیں:

۱ ـــ مسلمان مردوں اور عورتوں کو خواندہ (پڑھا لکھا) بنانے کی مہم

۲ ـــ حفظان صحت، صفائی ستھرائی، اور متوازن غذا کے بارے میں معلومات عام کرنا اور ان پر عمل کے ذریعے جسمانی طاقت میں اضافہ چاہنا۔

۳ ـــ علم وہنر میں اضافے کی مہم، خاص کر ایسی مہارت کا حصول جو بازار میں اچھے دام بک سکے۔

۴ ـــ معاشی سرگرمی کے لیے مالی وسائل فراہم کرنے کا نظم بنایا جائے۔ خاص طور پر ایسے افراد کے لیے جو خود روزگاری (سلف ایمپلائمنٹ) کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

ہمارے خیال میں سارے مسلمانوں، بالخصوص اسلامی تحریکوں کو یہ چار کام پوری توجہ سے کرنے چاہئیں تا کہ وہ اپنے قریبی ماحول میں، ملکی سطح پر اور پوری انسانیت کے درمیان اسلام کی عملی نمایندگی اور اس کی طرف دعوت کا کام کامیابی کے ساتھ کرسکیں۔ ہمارے خیال میں ان کاموں سے غفلت کی وجہ سے مسلمان بہت کچھ کھو چکے ہیں، اور اسلامی تحریکیں بھی پیچھے رہ گئی ہیں۔ ان کے متوسلین عصر حاضر میں وہ مؤثر کردار نہ ادا کرسکے، جس کی ان سے توقع کی جاتی تھی۔ مزید غفلت پسماندگی کو پامالی میں بدل سکتی ہے اور یہ تحریکیں اپنے افراد سمیت اتنی بے اثر بن سکتی ہیں کہ دوست دشمن سب ان سے بے نیاز ہو جائیں، خدا نہ کرے ایسا ہو۔

اگرچہ اسلامی تحریکوں کے پیچھے رہ جانے میں دوسرے اسباب وعوامل کو بھی دخل ہے جن میں سے بعض ہماری دسترس سے باہر بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر مذکورہ بالا چار کام ایسے ہیں جو ہم کر سکتے ہیں اور ان کے کرنے سے دیگر اسباب وعوامل کے علی الرغم تحریک آگے بڑھ سکتی ہے یہ امید بھی بجا ہوگی کہ جب ہم ان کاموں کو پوری قوت سے انجام دیں گے تو ان دوسرے کاموں کی طرف بھی زیادہ توجہ دیں گے، جن پر تحریک شروع سے زور دیتی رہی ہے۔ یعنی تجدید ایمان، مخلصانہ عبادات، اسلام کا علم عام کرنا اور نظام تعلیم کی اصلاح وغیرہ۔

کل اور آج

بعض لوگوں کو یہ کھٹک محسوس ہوسکتی ہے کہ جو کام کل اہم نہیں سمجھے گئے تھے وہ آج کیوں اہم ہوگئے؟ اس سے آگے بڑھ کر بعض اس خیال میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ قرون اولی میں ان کاموں کو اہمیت نہیں دی گئی تھی، جن پر ہم زور دے رہے ہیں۔ حالاں کہ یہ خیال تاریخی طور پر غلط ہے۔

چودہ سو سال پہلے ناخواندہ ہونے کے جو معنی تھے آج اس سے بالکل مختلف ہیں۔ اس وقت ۹۰ فیصد سے زیادہ لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے رہے ہوں گے اور زندگی کے سارے کام، یا

زیادہ تر کام، لکھنے پڑھنے کے بغیر چل سکتے تھے۔ لکھت پڑھت نہ نجی کاروبار میں ضروری تھی نہ حکومت کے نظم و انصرام میں ناگزیر تھی۔ جہاں ضرورت پڑتی وہاں چند لکھے پڑھے لوگوں کی خدمات حاصل کر کے کام چلایا جاسکتا تھا۔ اس کے باوجود ''اقرا'' (پڑھو!) کے حکم الٰہی (۳) کے بعد صورت حال بدلنے لگی اور بعض معاملات میں تو لکھ لینے کی تاکید کر دی گئی۔ (۴) بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر نبی ﷺ نے لکھانے پڑھانے کا اہتمام کیا اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس مہم کو اور آگے بڑھایا۔ (۵) حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تعلیمی وظیفے جاری کیے (۶) انہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں دارالخلافہ بغداد ہی نہیں بلکہ اسلامی حدود میں واقع زیادہ تر شہر علم و دانش کا گہوارہ بن گئے، ڈاک کا وسیع نظام قائم ہو گیا اور حکومت ہی کے نہیں تجارت کے حساب کتاب بھی لکھے جانے لگے۔ پڑھا لکھا ہونا سماجی عز و شرف کی لازمی شرط بن گیا۔

ازالہ ناخواندگی

ہم بیسویں صدی کے آخر اور اکیسویں صدی کے آغاز کی جس دنیا کی بات کر رہے ہیں، اسے دیکھنے کے لیے اگر ہمارے وہ اسلاف آجائیں، جنہوں نے بارہ، چودہ سو سال پہلے لکھنے پڑھنے کی مہم چلائی تھی، تو وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے کہ امت اسلامیہ کی آدھی تعداد لکھنا پڑھنا نہیں جانتی (۷) جب کہ زندگی کے حالات ایسے ہو چکے ہیں کہ لکھے پڑھے بغیر کوئی کام بھی ٹھیک سے کرنا دشوار ہے۔ راستہ چلنا ہو یا سواری پکڑنا، موسم کا حال معلوم کرنا ہو یا کسی جگہ امن و امان کی صورت حال دریافت کرنا۔ چیزوں کا نرخ معلوم کرنا ہو یا اپنے مال کی کھپت کا اندازہ لگانا۔ دوا علاج کا معاملہ ہو یا گھر کی تعمیر کا۔ تفریح مقصود ہو یا سائنس کے جدید ترین انکشافات جاننے ہوں۔ دوستوں کی مزاج شناسی مطلوب ہو یا دشمنوں کی سازشوں سے واقفیت درکار ہو۔ غرض کہ کوئی کام ایسا نہیں جو پڑھے لکھے بغیر پورا ہو سکے۔

ان پڑھ کے لیے روزی کمانے کا دائرہ بھی روز بروز تنگ ہوتا جا رہا ہے کیوں کہ مشینوں کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے اور ہر مشین کے استعمال کا ڈھنگ، مرمت کے طریقے وغیرہ لکھ کر آتے ہیں۔ کھیتی باڑی میں بھی اب وہی لوگ آگے ہیں جو اچھی کھاد، اچھے بیج، مناسب موسم اور آب پاشی کے صحیح طریقوں کا علم حاصل کریں اور اپنی پیداوار کو صحیح وقت پر بازار میں لائیں (۸) آج ناخواندہ

لوگ بمشکل اتنا کما سکتے ہیں کہ دو وقت پیٹ بھر سکیں۔ وہ نہ خود کچھ اور کر سکتے ہیں نہ اپنے بچوں کو کچھ اور کرنے کے قابل بنا سکتے ہیں۔ بلکہ اس کا ڈر ہے کہ ناخواندہ والدین کے بچے ناخواندہ ہی رہ جائیں۔ جب بات ہو اسلامی تحریک، شہادت حق اور دین کی سربلندی کی تو یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ایک ایسے کام سے غفلت برتی جائے، جس کے بغیر سارے کام خراب ہوتے ہوں۔

آج کے زمانے میں تبلیغ و اشاعت دین کے کام کو مؤثر طریقے سے انجام دینے کے لیے جدید ترین ذرائع اور وسائل سے کام لینا ضروری ہے۔ پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سمعی اور بصری کیسٹ، انٹرنٹ، ویب سائٹ وغیرہ کے ذریعے انسانوں کی بھاری تعداد کو مخاطب کیا جاسکتا ہے۔ غیروں کو دعوت سے زیادہ اپنوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ان وسائل کو استعمال کرنا ضروری ہے لیکن جب تک حروف شناسی اور اعداد شماری کی صلاحیت عام نہ ہو ان ذرائع سے فیض یابی اور فیض رسانی دونوں محدود رہتی ہے۔

اسلامی معاشرے کا نظام شورائی ہونا چاہیے جس میں عوام عام مسائل میں دلچسپی لیں، رائے ظاہر کریں اور فیصلوں پر اثر انداز ہونے کے طریقے اختیار کریں۔ بڑی آبادیوں میں اس مقصد کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں، مثلاً پریس اور دوسرے ذرائع ابلاغ وہ اسی وقت مؤثر ہوں گے جب خواندگی عام ہو۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ سماج میں زیادہ لوگ بے پڑھے لکھے ہوں تو پڑھے لکھے لوگوں کی کارکردگی پر بھی اس کا برا اثر پڑتا ہے۔ کیوں کہ ان کی وجہ سے کام کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ (۹) بھلا ایسا معاشرہ ان معاشروں سے کیسے مسابقت کر سکتا ہے، جن میں خواندگی کی شرح پچانوے فیصد ہو۔

برصغیر میں آزادی سے دس پندرہ سال پہلے کی فضا پر سیاست کا غلبہ تھا اور دوسرے سارے کام غیر اہم معلوم ہوتے تھے۔ جب اسلامی تحریک چلانے والوں نے یہ دیکھا کہ سیاست کی دنیا میں اسلامی سیاست، اسلام کے سیاسی مقصد اور اسلامی نظام زندگی کا ذکر کم ہے تو انہوں نے اس پر زور صرف کیا کہ مسلمانوں کی سیاست میں اسلام کو اور اسلام کے تصور میں سیاست کو اس کا صحیح مقام دلوائیں۔ اس وقت ازالہ ناخواندگی کی مہم اس لیے نہ چلائی جاسکی ہوگی کہ ساری قوت دوسرے کاموں میں لگی رہی اور بعض کاموں کے لیے آزادی کے بعد کے وقت کا انتظار رہا۔

مصر و شام میں اٹھنے والی اسلامی تحریکوں اور جنوبی مشرقی ایشیا بالخصوص انڈونیشیا میں اسلامی تحریک نے اجنبی تسلط سے نجات حاصل ہونے کے بعد قائم کیے جانے والے نظام میں اسلامی تعلیمات کو ان کا صحیح مقام دلوانے کی کوششوں کو اپنا مرکز توجہ بنایا۔ اگرچہ برصغیر کی طرح ان علاقوں میں بھی اسلامی تحریکوں کے طفیل کتابیں پڑھنے پڑھانے کا رواج بڑھا مگر ازالہ ناخواندگی کی خاطر خواہ مہم نہ چل سکی۔ آزاد مسلم ممالک میں اس مہم سے غفلت کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ معاشی ترقی اور معاشی قوت کی اہمیت بروقت نہیں سمجھی جاسکی اور نہ یہ شعور عام ہوا کہ عصر حاضر میں غریبی کا ازالہ ناخواندگی دور کیے بغیر ممکن نہیں (۱۰) اور یہ بھی ممکن نہیں کہ علمی معیار اونچا کیے بغیر کوئی قوم معاشی قوت حاصل کر سکے۔ (۱۱)

خرابی میں اس لیے اور اضافہ ہوتا گیا کہ آزادی کے بعد جو حکومتیں قائم ہوئیں، انہوں نے معاشی ترقی کے منصوبوں میں اینٹ پتھر اور فولاد پر زیادہ زور دیا انسان کی طرف کما حقہ توجہ نہ کر سکیں۔ ازالہ ناخواندگی اور تعلیمی ترقی کی، جو اسکیمیں بنائی گئیں، وہ زیادہ تر کاغذ پر رہ گئیں یا کرپشن کا شکار ہوگئیں۔ الا ماشاء اللہ۔ زیادہ تر ترقی پزیر ممالک میں جن میں مسلمان ممالک اور ہندوستان شامل ہیں، اس بارے میں خاطر خواہ پیش رفت نہ ہوسکی۔ نصف صدی گزرنے پر اب یہ احساس ہو رہا ہے کہ زیادہ تر مسلمان ملکوں اور مسلمان اقلیتی گروہوں میں ناخواندگی پس ماندگی کا سبب بنی ہوئی ہے، جہاں تک ہندستانی مسلمانوں کا سوال ہے وہ یقینی طور پر پڑھنے لکھنے کے میدان میں برادران وطن سے پیچھے ہیں (۱۲) خاص طور پر مسلمان عورتوں میں خواندگی کا تناسب بہت کم ہے ۸۰ فیصد سے زیادہ مائیں ناخواندہ ہوں تو اگلی نسل کی اکثریت کا پڑھا لکھا ہونا کیسے ممکن ہوگا؟

وقت آگیا ہے کہ تلافی مافات کی کوشش کی جائے اور اس تردد میں نہ پڑا جائے کہ جو کام کل نہیں کیا، وہ آج کیوں کریں۔ تحریک اسلامی کے شروع کے دور میں تو ہم نے بعض دوسرے کام نہیں کیے تھے جو گزشتہ ۲۵ سال سے بجا طور پر ہمارا مرکز توجہ بنے ہوئے ہیں۔ مثلاً علاقائی زبانوں میں ترجمہ قرآن وحدیث اور غیر مسلم بھائیوں سے ربط عام۔ زندہ قومیں اور فعال تحریکیں اپنی ترجیحات کو حالات کے تقاضوں کے مطابق ڈھالتی رہتی ہیں۔

صحت اور صفائی

اب حفظان صحت، متوازن غذا اور جسمانی طاقتوں کے مسئلے پر نظر ڈالیے۔ ۶۰-۷۰ سال پہلے بھی یہ مسئلہ موجود تھا مگر اس میں یہ شدت نہیں تھی۔ جس تبدیلی نے اسے غیر معمولی اہمیت دے دی ہے، وہ ماحول میں بڑھتا ہوا تلوث اور آلودگی، انسانی آبادیوں کا دیہاتوں کی کھلی فضا سے شہروں کی گھٹی ہوئی فضا میں منتقل ہونے کا سلسلہ اور غذا میں مصنوعی عناصر کا بڑھتا ہوا تناسب ہے۔ پہلے سے کہیں زیادہ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ پینے کا پانی صاف ہو گندگی اور آلائش کو دور رکھنے اور غذا میں پھل اور سبزی جیسے عناصر کو بڑھانے اور روغن اور لحمیات کا تناسب کم کرنے پر زور دیا جاتا رہے اور ورزش کرنے اور امراض سے بچنے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کرنے کی تلقین کی جائے تاکہ انسان کی قوت بحال رہے اور وہ اچھے کاموں کی طرف توجہ کر سکے۔ کوئی وجہ نہیں کہ جو لوگ مسلمانوں کو اچھے کاموں میں لگانا چاہتے ہیں۔ وہ ان کی صحت بہتر بنانے کی طرف نہ توجہ کریں۔ حدیث نبوی ﷺ میں آیا ہے کہ قوی مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر اور اللہ کو زیادہ پسند ہے۔ (۱۳) ایک مجلس میں نبی ﷺ کے سامنے مالی خوش حالی کا ذکر ہو رہا تھا تو آپ نے فرمایا ''تقوی والے کے لیے مالی خوش حالی میں کوئی مضائقہ نہیں، مگر متقی کے لیے صحت، مالی خوش حالی سے بہتر ہے اور خوش مزاجی بڑی نعمت ہے۔ (۱۴)'' آپ ﷺ کی دعاؤں سے ظاہر ہے کہ آپؐ جسمانی طاقت کی بڑی قدر کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دعا میں آیا ہے:

''یا اللہ! میرا قرض ادا کرا دے، میری غریبی دور کر اور میرے سننے دیکھنے کی صلاحیت اور میری طاقت کو اپنے راستے میں کارآمد بنا دے۔'' (۱۵)

ازالہ غربت

پڑھنے لکھنے اور صحت و صفائی کی اہمیت معاشی بہتری اور مادی ترقی کے ذکر کے بغیر بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ اخلاق اور روحانیت تک بات محدود رہے تو بھی لوگوں کو حفظان صحت اور حصول علم کی ضرورت کا قائل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آگے ہم جن دو کاموں کا ذکر کرنے جا رہے ہیں

یعنی فنی مہارت کا حصول اور مالیات کی فراہمی وہ براہ راست معاشی زندگی سے متعلق ہیں۔ اگر کوئی اس وہم میں مبتلا ہو کہ مادی وسائل جمع کرنے کا اہتمام اور معاشی استحکام اسلام میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور اسلامی تحریکوں کو ان کاموں کو مرکز توجہ بنانا مناسب نہیں ہے تو وہ ہماری باتوں کو خاطر میں نہیں لائے گا۔ اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ یہ غلط فہمی دور کر دی جائے۔

ہم یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ عصر حاضر میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اسلامی تحریکیں مسلمان افراد، گروہوں اور ملکوں کی معاشی حالت بہتر بنانے کو اپنا مرکز توجہ بنائیں کیوں کہ مستقبل کی دنیا میں اسلام کو اس کا صحیح مقام اسی وقت ملے گا، جب اہل اسلام دوسروں کے محتاج اور ان کے آگے دست سوال دراز کرنے والے بن کر رہنے کی بجائے اپنی محنت اور ذہانت سے اپنی معاش حاصل کرنے والے بن چکے ہوں اور ان کے پاس اتنے وسائل ہوں کہ وہ دوسروں کی بھی مدد کر سکیں۔

پہلے اس بات پر غور کیجیے کہ آج غریب ہونے اور چودہ سو سال پہلے غریب ہونے کے معنی کتنے مختلف ہیں، پینے کے پانی پر نظر ڈالیے پہلے زمانے میں امیر اور غریب سب کوئیں، چشمے یا دریا کا پانی پیتے تھے۔ اس پانی کو کسی پیچیدہ عمل کے ذریعہ صاف کرنا ضروری نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ زمانہ ماحول کی کیمیاوی آلودگی کا زمانہ نہیں تھا۔ آج دنیا کے بڑے شہروں میں رہنے والے دریاؤں، چشموں اور کنووں سے بہت دور رہتے ہیں۔ کوئی ان کے قریب بھی ہو تو کیمیاوی آلودگی کے سبب ان کا پانی پینے کے قابل نہیں رہا۔ ضروری ہے کہ قدرتی ذخیروں سے حاصل کیے ہوئے پانی کو پیچیدہ کیمیاوی عمل کے ذریعہ صاف کر کے پلاسٹک کے پائپ کے ذریعہ گھر گھر پہنچایا جائے۔ اسی لیے شہری آبادی کو پینے کا پانی مفت نہیں ملتا۔ اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ غریب کی غریبی نہ دور ہو تو اسے پینے کا پانی کہاں سے ملے گا؟

پانی کے بعد غذا، لباس، مکان، نقل و حمل کے ذرائع، تعلیم اور دوا علاج بھی بنیادی ضروریات زندگی ہیں۔ غور کیجیے تو انسان کی ساری ترقیوں کے باوجود غریب کے لیے آج ان ضروریات کی تکمیل پہلے زمانے سے زیادہ دشوار ہے، جس سادہ اور معمولی کپڑے سے پہلے ضرورت پوری ہو سکتی تھی، وہ زمین سے عام آدمی کا رشتہ کٹ جانے کی وجہ سے، اب بغیر پیسوں

کے نہیں میسر آ سکتا۔ جب زیادہ تر آدمیوں کی معیشت زمین کی پیداوار سے براہ راست مربوط تھی تو ضروری حد تک غذا اور لباس کا حصول اتنا دشوار نہ تھا، جتنا اب ہے۔ اب انسانوں کی غالب اکثریت اپنی خوراک اور لباس براہ راست زمین سے نہیں پیدا کرتی بلکہ بازار سے خریدتی ہے۔ قوت خرید ہو تو ضرورت پوری ہو ورنہ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ سماج کے پاس غلے اور کپڑے کی فراوانی کے باوجود آبادی کا قابل لحاظ حصہ جیب خالی ہونے کی وجہ سے نیم فاقہ کشی اور نیم برہنگی کی زندگی گزارتا رہتا ہے۔ (۱۶)

آبادی کی تیزی سے شہروں کی طرف منتقلی کی وجہ سے مکان کا مسئلہ بھی پہلے سے زیادہ دشوار ہو گیا ہے۔ پہلے زمانے میں غریبوں کے لیے یہ زیادہ مشکل نہ تھا کہ وہ آبادی کے مرکزوں سے دور کسی غیر آباد زمین پر سر چھپانے کا کوئی انتظام کر لیں، لیکن آج کے بڑے شہروں میں یہ قانوناً ناممکن اور عملاً دن بہ دن زیادہ مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ دنیا کے شہروں میں بے گھر لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، جو سڑکوں کے کنارے یا کسی پارک وغیرہ میں رات گزارتے ہیں اور ایشیاء، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے ترقی پذیر ممالک کے ہر بڑے شہر میں لاکھوں انسان جھگی، جھونپڑی (کچی آبادی) میں رہتے ہیں۔ حکومتوں کی یہ کوشش کہ وہ سستے مکان بنا کر ان لوگوں کو وہاں منتقل کر دیں، کامیاب نہیں ہو رہی ہے۔ کیوں کہ ان کے محدود وسائل شہری آبادی میں غریبوں کے اضافے کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکے۔ اب اکیسویں صدی کی دہلیز پر یہ نظریہ بھی مشکوک قرار دیا جا رہا ہے کہ مکان فراہم کرنے اور دوسری بنیادی ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری میں ریاست بھی شریک ہے۔ مگر یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ نفع کو مقصود بنا کر چلائی جانے والی ''بازار کی معیشت'' میں غریبوں کے لیے سر چھپانے کے لیے سستے مکانوں کی فراہمی خود بخود عمل میں نہیں آتی۔ (۱۷) مسلمان ممالک ہوں یا ہندوستان جیسے دوسرے ترقی پزیر ممالک، شہریوں کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا یہ طریقہ زیادہ بہتر ہے کہ انہیں خود اپنی روزی کمانے کے لائق بنایا جائے اور حکومت کی امداد (اور مسلمانوں کی زکوٰۃ) ان لوگوں کے لیے مخصوص ہو، جو بڑھاپے، کم سنی، مرض یا کسی اور سبب سے اپنی روزی خود کمانے سے قاصر ہوں۔

عام آدمی کو دو وقت روٹی، تن ڈھکنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو مکان کی ضمانت دینے کے لیے غربت دور کرنے اور ہر فرد کو ایک خاص مقدار میں قوت خرید بہم پہنچانے کی اجتماعی کوشش اس

لیے بھی ضروری ہے کہ آبادی کی کثرت اور چاروں طرف سے بند تنگ مکانوں میں رہائش کے رواج کی وجہ سے اب کسی کو اپنے پڑوسیوں کا حال بہ مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک بے گھر غریبوں کا سوال ہے تو وہ آبادی کے ایک سرے پر رہتے ہیں، جہاں سے خوش حال لوگ کم ہی گزرتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں حسن ارادہ کے باوجود امیروں کی خیرات سے غریبوں کی حاجت روائی اسی وقت اور اسی حد تک ہوسکتی ہے، جب کہ ایسے سماجی ادارے وجود میں آئیں، جو دینے والوں سے امداد جمع کر کے اسے ضرورت مندوں تک پہنچانے کا اہتمام کریں۔ چودہ سو سال پہلے نہ آبادیوں کی ساخت ایسی تھی نہ مسئلے نے اتنی شدت اختیار کی تھی۔ پھر بھی حکمت ربانی نے نظام زکوٰۃ کو لازمی قرار دیا۔ آج وہ نظام بھی نہیں قائم رہا اور مسئلہ ہزار گنا سنگین ہو چکا ہے۔

نقل وحمل کے وسائل کی کل کے غریب کو کیا ضرورت پڑتی ہوگی؟ پوری زندگی میں ایک آدھ لمبے سفر کے لیے یا اپنی چھوٹی سی بستی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے کے لیے۔ مگر آج کا غریب ممبئی، کراچی، قاہرہ، یا لاس اینجلز جیسے ایک کروڑ انسانوں کی آبادی والے شہروں میں رہنے پر مجبور ہے، جن میں فاصلے اتنے لمبے ہیں کہ پیدل چلنے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ جب پینے کا پانی مفت نہیں ملتا تو راستے طے کرنے کے لیے ریل یا بس کا سفر کیوں کر مفت میسر ہوسکتا ہے۔ کام پر جانے کے لیے یا بچوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے فاصلے طے کرنا ضروری ہے لیکن اس کے وسائل سے محرومی ہے۔ یہ ہے وہ صورت حال جس میں دنیا کے اکثر غریب مبتلا ہیں۔ اس ضرورت کی بھی تکمیل جب ہوگی جب غریب کے ہاتھ میں قوت خرید آئے گی۔ ناداروں کو نقل وحمل کی سہولت مفت فراہم کرنے کا رواج دنیا میں کہیں نہیں ہوسکا کیوں کہ نادار اور صاحب استطاعت میں برموقع تمیز ممکن نہیں اور لوگوں کو نقل وحمل کی خدمات فراہم کرنے میں خاصی لاگت آتی ہے۔

کچھ ایسا ہی معاملہ دوا علاج کا بھی ہے۔ گندی ہوا میں سانس لینے اور ناقص غذا پر گزارا کرنے کے بعد اس کی امید رکھنا کہ آدمی بیمار نہ پڑے، وہ بھی غریب آدمی جس کا نہ گھر صاف نہ محلّہ جسے نہ پھل نصیب نہ دودھ۔ یہ خام خیالی ہے۔ بیمار کو دوا علاج کے لیے پیسے چاہئیں۔ دوا علاج مفت میسر آنا دشوار ہے کیوں کہ طب کی تعلیم دینے، اسپتال کھولنے اور دوائیں بنانے ہر کام میں کثیر مصارف ہوتے ہیں وہ کہاں سے آئیں گے؟ ناداروں کے لیے مفت دوا علاج کی فراہمی

کا جزئی انتظام ہر ملک میں پایا جاتا ہے مگر ترقی پذیر ممالک میں اب وسائل کی کمی اور کرپشن کی وجہ سے غریبوں کو اس سے بہت کم فائدہ پہنچتا ہے۔ رہے ترقی یافتہ ممالک تو اب ان کا رجحان بدل رہا ہے۔ کیوں کہ تجربہ نے ان کو یہ سکھایا ہے کہ افراد کو اپنی صحت کا انشورنس کرانے کا خود ذمہ دار بنایا جائے اور ٹیکس کے پیسوں سے مفت علاج کی سہولت صرف ایمرجنسی میں فراہم کی جائے۔

تعلیم بالخصوص ابتدائی تعلیم کی اہمیت جتنی فرد کے لیے ہے، اتنی ہی سماج کے لیے ہے اس لیے مفت لازمی ابتدائی تعلیم کا طریقہ اختیار کرنا ضروری سمجھا گیا۔ ترقی یافتہ ممالک نے اس پر عمل کر دکھایا اور کمیونسٹ ممالک نے بھی اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو اپنی آبادیوں میں تقریباً صد فی صد ابتدائی تعلیم عام کر دی۔ مگر جب ترقی پذیر ممالک نے ایسا کرنا چاہا تو وسائل کی محدودیت، کرپشن، اور عوام کی بے اعتنائی کے سبب ان کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، اب صورت حال یہ ہے کہ ٹیکس کے پیسوں سے مفت تعلیم دینے کا رجحان کمزور پڑتا جا رہا ہے۔

اس اصول کو ماننے کے باوجود کہ حکومتوں کو ابتدائی تعلیم اور بنیادی حفظان صحت کا اہتمام سب کے لیے کرنا چاہیے اور اس کے مصارف ٹیکس سے پورے کرنے چاہئیں، عملی حقیقت، کم از کم مسلمان اقلیتی گروہوں اور تیل کی دولت سے محروم مسلمان ملکوں کے لیے یہی ہے کہ وہی افراد اپنے متعلقین کی تعلیم اور دوا علاج کا معقول انتظام کر سکیں گے، جو اتنی قوت خرید رکھتے ہوں کہ فیس ادا کر کے متعلقہ خدمات حاصل کر سکیں۔

یہ رہی انفرادی سطح پر غربت کے ازالے کی ضرورت۔ اب ملکی سطح پر سوچیے ایک مسلمان ملک کے غریب ہونے کے کیا معنی ہیں۔ اس کے لیے قیاس آرائی کی ضرورت نہیں۔ تیل کی دولت سے مالا مال چند ملکوں کو چھوڑ کر افریقہ اور ایشیاء کے اکثر مسلم ممالک، جن میں افغانستان، صومالیہ اور مالی جیسے دنیا کے غریب ترین ممالک شامل ہیں۔ دوسروں کے دست نگر بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ ممالک تقریباً ہر چیز کے لیے مدد کے محتاج ہیں اور مدد دینے کی صلاحیت صرف مغرب کے ترقی یافتہ ممالک میں ہے۔ یہ ملک جب مدد دیتے ہیں تو اس کی قیمت بھی وصول کر لیتے ہیں گزشتہ نصف صدی کی تاریخ بتا رہی ہے کہ جو ملک مغربی ممالک کی امداد کے سہارے جیتے ہیں، وہ ان کے تابع بن کر رہ گئے ہیں۔ ان ملکوں سے یہ توقع رکھنی فضول ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے حقیقی مفادات کے محافظ بن کر رہیں گے۔ ان کو تو اپنے اَن داتا ملکوں کے مفادات کی آماجگاہ

بنایا جاچکا ہے۔ رہا سوال شہادت حق اور دعوت الی الخیر کا تو آپ گداگر سے درس اخلاق کی اُمید کیسے کر سکتے ہیں اور اگر وہ ایسا کر بیٹھا تو اس کی بات کو وزن کون دے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ کئی سو سال سے اسلامی دنیا سے کوئی فکری یا عملی فیض عام انسانیت کو نہیں پہنچا، جو ان کو اس پیغام کی طرف متوجہ کر سکتا ہے، جس کی یہ امت علمبردار ہے۔ نہ علم و داب کے میدان میں نہ ہنر اور کاریگری میں ہمارے اندر ایسے قد آور لوگ نمودار ہوئے جن کی طرف نظریں اٹھانے پر عام انسان مجبور ہو جاتے، الا ماشاء۔ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کو تہذیبی درس دینے کا حوصلہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب اسلامی دنیا کا کھویا ہوا وقار بحال ہو اور اس کی پہلی شرط دوسروں کی دست نگری سے چھٹکارا پانا ہے۔

طاقت کی اہمیت

کل کے مقابلے میں آج جو بڑی تبدیلیاں آئی ہیں، ان میں سرفہرست جنگ اور دوسروں کو زیر کرنے کے ایسے وسائل کو بھی رکھا جائے گا جو سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی سے وجود میں آئے ہیں۔ جانوروں پر سوار ہو کر تلوار اور نیزے کے ذریعہ لڑنے کی جگہ ٹینک، بمبار جہازوں اور میزائل نے لی تب ہی یہ ظاہر ہو گیا کہ جن کے ہاتھ ان وسائل سے خالی ہوں وہ ان کے ماتحت بن کر رہنے پر مجبور ہوں گے، جو ان کے بنانے اور برتنے والے ہوں۔ مگر ایٹمی اسلحوں کی ایجاد اور ان کے استعمال کی قدرت پر چند ملکوں کی اجارہ داری کے بعد یہ صورت حال اور مستحکم ہو گئی۔ اب معلومات کی فراہمی اور کسی ہدف کو نشانہ بنانے کے تقریباً بے خطا وسائل کی ایجاد کے بعد تو یہ طے سمجھنا چاہیے کہ دنیا اس کے ہاتھوں میں رہے گی، جس کے ہاتھوں میں سائنس اور ٹکنالوجی ہو، ان کو چیلنج کرنا ہو یا ان کی راہ سے الگ راہ چلنا ہو تو سائنس اور ٹکنالوجی میں خود کفیل بننا ہو گا۔

ہماری رائے میں بعض مغربی مبصرین کا یہ خیال ضروری نہیں کہ صحیح نکلے کہ مستقبل قریب میں عالمی تہذیبوں کا باہمی ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ یا یہ کہ اسلام اور مغربی تہذیب کا باہم ٹکراؤ ہو کر رہے گا۔ (۱۸) لیکن یہ تو طے ہے کہ اگر اسلامی تہذیب کے علمبردار ملکوں اور جسے ''مغربی تہذیب'' کہا جاتا ہے، اس کے علمبردار ملکوں کے درمیان فوجی طاقت کا توازن وہی رہا، جو اس وقت ہے تو فیصلہ کن عالمی امور میں اسلامی ملکوں کی بات نہیں چلے گی بلکہ مغربی ملکوں کی بات چلے گی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے۔ کمزور طاقتور پر حکم نہیں چلا سکتا۔

تاریخ نہ جاننے کی وجہ سے بعض لوگوں کو اس بارے میں تردد لاحق ہوسکتا ہے کہ روحانی، اخلاقی اور مذہبی تحریکیں فوجی طاقت بڑھانے اور اس کے ذریعے کے طور پر مادی ترقی اور معاشی استحکام کے لیے کوشش کریں۔ مگر اللہ کی کتاب کی صریح نص کی روشنی میں اس تردد کی کوئی گنجائش نہیں (۱۹) مزید برآں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ پہلی صدی ہجری، ساتویں صدی عیسوی میں ساری دنیا میں ایک ہی فوجی ٹکنالوجی پائی جاتی تھی۔ روم کے عیسائی ہوں یا فارس کے آتش پرست، ان کے پاس بھی تیر وتفنگ اور اونٹ گھوڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا اور یہی چیزیں عربوں کے پاس بھی تھیں۔

آج صورت حال بالکل مختلف ہے۔ انسانوں کو ہلاک کرنے، پورے علاقوں کو تہس نہس کرنے اور ملکوں کو ماتحت بنانے کے آلات ووسائل جن سے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہیں دریافت ہوسکی ہے، دنیا میں صرف چند ملکوں کے پاس ہیں۔ اسلام کے علمبرداروں کو کسی پر فوج کشی نہیں کرنی ہے۔ لیکن اگر اسلام پر کاربند ہونے کی وجہ سے کوئی ان پر فوج کشی کرے تو ان میں اتنی قوت تو ہونی چاہیے کہ اپنا دفاع کرسکیں اور جس علاقے میں وہ بستے ہوں اس میں اللہ کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔

مسلم اقلیتوں کی خستہ حالی

بات دور جارہی ہے۔ موضوع یہ تھا کہ ملکی سطح پر محتاجی وبال ہے اور یہ کیفیت اسلامی اعتبار سے ہمیں کسی کام کا نہیں رکھتی۔ اسے ختم ہونا چاہیے۔ اب ان مسلمان گروہوں کو لیجیے جو غیر مسلم اکثریتوں کے درمیان بستے ہیں۔ ہندوستان میں تقریباً ۱۲ کروڑ مسلمان تقریباً ۱۰۰ کروڑ کی مجموعی آبادی کے درمیان رہتے ہیں جب کہ چین کی ۱۲۰ کروڑ آبادی میں پانچ کروڑ مسلمان چین کے مجموعی رقبہ کے پانچویں حصہ پر پھیلے ہوئے صوبہ سنکیانگ میں اکثریت رکھتے ہیں۔ آنے والی صدی چین اور ہندوستان کی صدی بتائی جاتی ہے۔ کیوں کہ دنیا کی تقریباً تہائی آبادی ان دو ملکوں میں ہوگی مگر دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں کے مسلمان اپنے برادران وطن کے ساتھ ساتھ ترقی کررہے ہیں یا ان سے پیچھے رہے جارہے ہیں۔ اگر یہ اہل وطن کے محتاج اور دست نگر ہیں، ان کو کچھ دینے کی صلاحیت سے عاری اور ہر چیز ان سے لینے پر مجبور ہیں، تو یہ ممکن نہیں ہوگا کہ وہ ان ملکوں میں یا ان کے توسط سے عالمی سطح پر کوئی وزن ڈال سکیں۔ ایسا کرنا ہو تو

پہلے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہوگا اور اپنے ماحول میں ایک باوقار اور باعزت مقام حاصل کرنا ہوگا۔ مگر سردست تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ لوگ باقی رہ سکیں گے؟ کیا یہ اس طرح باقی رہیں گے کہ ان کا مذہبی تشخص برقرار رہے۔ (۲۰) ہندوستانی مسلمان کی تعداد زیادہ ہے اور ان کا ماضی بھی مشرقی ترکستان سے مختلف ہے۔ اس لیے ابھی انہیں اتنی پستی میں نہیں دھکیلا جاسکا ہے۔ مگر رجحان کیا ہے؟ ان کی طاقت کس رفتار سے بڑھ رہی ہے اور ملک کی مجموعی طاقت کس رفتار سے بڑھ رہی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے جو علمی اور تحقیقی کام ہونا چاہیے تھا، وہ ابھی نہیں ہوسکا ہے۔ نہ ایسے اعداد و شمار میسر ہیں جن کی بنیاد پر کوئی قیاس آرائی کی جاسکے۔ مگر بعض محققین کی یہ رائے ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ دنیا کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں کا جو تناسب ہے اس کے مقابلے میں دنیا کی مجموعی آمدنی میں مسلمانوں کی آبادی کی مجموعی آمدنی کا تناسب بہت کم ہے اور یہ کہ ''زیادہ تر ملک جن میں مسلمان بھاری تعداد میں رہتے ہیں ان میں وہ اپنے غیر مسلم برادران وطن سے زیادہ غریب ہوتے ہیں۔'' (۲۱)

علم و ہنر اور فنی مہارت

اس مضمون کا پیغام یہ ہے کہ اپنے ماحول میں اسلام کی دعوت دینے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان اقلیتیں اور مسلم اکثریت والے ملک اپنی معاشی حالت بہتر بنائیں تاکہ وہ ان لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے بچ سکیں جن کو وہ درس حیات دینا چاہتے ہیں اور طلب گار ہونے کی بجائے مددگار بن کر سامنے آئیں۔ مجوزہ پروگرام کے تیسرے جزء، علم و ہنر میں اضافہ اور ایسی مہارتوں کا حصول جن کی بازار میں طلب ہو، کو اسی سیاق میں دیکھنا چاہیے۔ روزی اللہ کے دست قدرت میں ہے مگر اس دنیا میں اس کا وسیلہ ایسا علم و ہنر ہے جو آدمی کو دوسروں کے لیے مفید بنادے اور وہ اس کی خدمات کے طلب گار ہوں ایک زمانے تک آمدنی زیادہ تر ملکیت سے وابستہ تھی، جس کے پاس جتنی زمین ہوتی وہ اتنا ہی امیر ہوتا۔ اسی طرح حال کے زمانے تک سرمایہ کی ملکیت آمدنی کا بڑا ذریعہ رہی۔ مگر آنے والی دنیا میں ان عناصر کا وزن کم ہوگا اور علم و ہنر اور فنی مہارت، ذہانت اور اپج آمدنی کا زیادہ مؤثر ذریعہ بنتے جائیں گے۔

نئے وسائل ابلاغ و اتصال نے یہ ممکن بنادیا ہے کہ خدمت کرنے والا ایک جگہ ہو اور

اس کی خدمت سے مستفید ہونے والا دوسری جگہ، مقامی بازار اور ملکی معیشت سے لے کر عالمی منڈی تک ہر جگہ ہنر اور فنی مہارت کی طلب روز افزوں ہے۔ مسلمان افراد اور گروہوں کے لیے ترقی کا راستہ یہ ہے کہ وہ علم و ہنر کے میدان میں آگے بڑھیں اور خود کو اعلیٰ فنی مہارت سے آراستہ کریں۔ اعلیٰ علمی صلاحیت اور فنی مہارت غربت کے جال سے نکالنے میں تو کامیاب ہوگی ہی، تعصب اور امتیازی سلوک کی دیواریں بھی زیادہ عرصے تک اس کی راہ نہ روک سکیں گی، جو دوسروں کو نفع پہنچا سکتا ہو۔ ایسا نفع جس کی دوسرے کو ضرورت ہو، اسے کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ فرد کی خدمت کا تعلق خواہ علاج معالجہ سے ہو یا تعمیرات سے، تعلیم سے ہو یا ابلاغ و اتصال سے، سرمایہ کاری سے ہو یا انشورنس سے سیر و سیاحت سے ہو یا تفریح و ریاضت سے، اگر دوسروں کو ان خدمات کی ضرورت ہے تو وہ معاوضہ دے کر اس کی خدمت حاصل کریں گے۔ شرط یہ ہے کہ مسلمان فرد دوسروں کے مقابلے میں اچھے معیار کا کام کرے۔

یہ نسخہ جس طرح مقامی سطح پر آزمایا جا سکتا ہے، اسی طرح ملکی اور عالمی سطح پر بھی کامیاب ثابت ہوگا۔ اصل سوال یہ ہے کہ ناخواندہ، کمزور اور غربت کے مارے افراد اور گروہوں کے علم و ہنر کی سطح کیسے بلند کی جائے؟ اس کا جواب تلاش کرنے سے پہلے قومی کارکنوں اور اسلامی تحریک سے وابستہ افراد کا اس امر پر اتفاق ضروری ہے کہ وہ اس کام کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے لیے مناسب اقدامات کریں گے۔

اس بارے میں پہل ان مدرسوں، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو کرنی چاہیے جو مسلمانوں کے زیر انتظام ہیں۔ ایسے اداروں کی بھی کمی نہیں جن کا انتظام اسلامی تحریکوں سے وابستہ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم پر نظر ثانی کریں۔ زبانی یاد کرنے کی بجائے سمجھنے اور نقل کی بجائے تجربے کرنے پر زور دیں اور علم کے ساتھ ہنر کا بھی چرچا کریں تاکہ ان سے فارغ ہو کر نکلنے والے ایسی خدمات انجام دینے کی صلاحیت لے کر نکلیں جن کی دنیا کو ضرورت ہے اور جو ان کی ذاتی خوش حالی کا نہیں ملک و ملت کی ترقی کا وسیلہ بن سکتی ہیں۔

مالیات کی فراہمی

اب پروگرام کے چوتھے جزء کو لیجیے۔ سو سال پہلے جب برصغیر کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے لیے مہم چلائی گئی تھی تو نظریں سرکاری ملازمت پر تھیں۔ ہوا بھی یہی کہ سرکاری ملازمتوں کا دائرہ بڑھتا گیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور مسلمانوں کے زیر انتظام چلنے والے دوسرے تعلیمی اداروں نے مسلمان نوجوانوں کو اس قابل بنا کر آگے بڑھایا کہ وہ ملازمتوں کے ذریعے روزی کمائیں اور اپنے منصب کے ذریعے انتظامات پر اثر انداز ہو کر مسلمانوں کے مفادات کی نگرانی بھی کریں۔ آج صورت حال بدل چکی ہے۔ سرکاری ملازمتوں کا دائرہ پھیلنے کی بجائے سکڑ رہا ہے البتہ نجی کاروبار پھیل رہا ہے۔ روزگار کے مواقع اب نجی کاروبار کے دائرے میں ہیں اور مقامی اور بیرونی مسابقت کا دباؤ تاحیات ملازمت کی جگہ ''کام کے مطابق دام'' کے اصول پر معاملہ کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

معیشت میں کچھ ایسی تبدیلیاں بھی ہو رہی ہیں، جن کی وجہ سے چھوٹے پیمانے پر کام کرنے کے مواقع بڑھ رہے ہیں۔ خاص طور پر خدمات کے میدان میں اس کا چلن عام ہے کہ کوئی آدمی کسی نئے طریقے کی ایجاد کی بنیاد پر ایک نیا کام شروع کرے اور کامیابی اسے تھوڑے عرصے میں دولت سے مالا مال کر دے۔ بسا اوقات چند ہنرمند نوجوان مل کر کسی کاروبار کی بنیاد ڈالتے ہیں، جو بڑھتا جاتا ہے اور ہزاروں افراد کو روزگار فراہم کرتا ہے۔ البتہ ایک شرط ایسی ہے جو نہ پوری ہو تو ایسی کامیابیاں نہ سامنے آئیں اور کتنے ہی مواقع ضائع ہو جائیں۔ یہ شرط ہے مالیات کی فراہمی۔ نئے کاروباری اقدام کرنے والوں کو معقول اور منصفانہ شرائط پر مالیات کی فراہمی کسی معاشرے کی معاشی ترقی کے لیے بہت اہم ہے۔

مسلمان ملکوں میں عام طور پر اور اقلیتی ملکوں میں خاص طور پر اس مشکل کے حل کے لیے خصوصی اقدامات ضروری ہیں۔ یہ کام ایسا نہیں جو بازار میں طلب اور رسد کی قوتوں کے بھروسے پر چھوڑا جا سکے کیوں کہ بازار کے ذریعے جو حل سامنے آتے ہیں، وہ ہو سکتا ہے اونچی شرح کے سود والے قرضے ہوں، ساتھ ہی قرض دینے والے بینک یا ضمانت یا رہن طلب کرتے ہیں۔ سود حرام ہونے کی وجہ سے یہ حل مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ مزید برآں جو نوجوان نئے خیالات کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں وہ رہن جائداد یا کسی اور طرح کی ضمانت بمشکل ہی پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے مسئلے کا حل زرخطرہ (وینچر کیپٹل) میں ہے جو نفع میں شرکت کے اصول

پر فراہم کیا جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے حال میں اسلامی مالیاتی اداروں کے قیام نے مسلمان ملکوں اور اقلیتی ملکوں کے مسلمانوں کے لیے ایسے سرمایہ کی فراہمی کے اچھے مواقع فراہم کر دیئے ہیں۔

اسلامی بینک، اسلامی انوسٹمنٹ کمپنیاں اور دوسرے اسلامی مالیاتی ادارے ایک ایسا مالیاتی ڈھانچا سامنے لا چکے ہیں، جن کو اپنا کر مسلمان ملک اور مسلمان اقلیتیں سود سے بچتے ہوئے اپنی ساری مالیاتی ضرورتیں پوری کر سکتی ہیں۔ یہ ادارے پیداواری عمل کے ہر دائرے میں مالی وسائل فراہم کر سکتے ہیں۔ یہ ادارے شرکت، مضاربت، سلم، استصناع اور اجارہ کے معروف اسلامی طریقوں کو مالیات کی فراہمی کی بنیاد بناتے ہیں، جن سے اسلامی سماج سیکڑوں سال سے مانوس ہے۔ ساتھ ہی اسلامی مالیاتی ادارے دور جدید کے ان نئے طریقوں کا بھی بھرپور استعمال کرتے ہیں جو سود سے پاک کیے جا سکتے ہوں اور ان میں جوے بازی کا مزاج نہ پایا جاتا ہو۔ اسلامی مالیاتی اداروں کی فکری بنیادوں اور عملی تاریخ کے بارے میں کافی لٹریچر موجود ہے (۲۲) ان اداروں کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں اچھی آمدنی آئے اور وہ اس کا قابل لحاظ حصہ بچا کر حلال طریقے سے نفع کمانے کے لیے اسلامی مالیاتی اداروں کے حوالے کریں کیوں کہ ہر صاحب مال خود نفع آور کاروبار نہیں کر سکتا۔ جب تک مسلمان افراد اور ادارے اپنی دولت کو حرکت میں نہیں لائیں گے اور ان کی آمدنیوں اور بچت میں اضافہ نہیں ہوگا تب تک اسلامی مالیاتی اداروں کے ذریعہ مسلمان کاروباریوں کو مالیات کی فراہمی خاطر خواہ مقدار میں نہیں ہو سکے گی۔ مسلمان افراد مسلم اقلیتی گروہوں اور مسلم اکثریت کے ممالک ہر ایک کے لیے اس بات کا شعور لازم ہے کہ اگلی صدی میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل شاندار بنانے کے لیے دولت کمانا، بچت کرنا اور اس بچت کو اسلامی مالیاتی اداروں کے ذریعہ نفع اور کاروبار میں لگانا ضروری ہے۔

اس احساس کے تحت کی جانے والی معاشی جدوجہد، بچت اور سرمایہ کاری کا اس دنیوی حرص و ہوس سے کوئی تعلق نہیں جس کے بارے میں ایک حدیث قدسی میں آیا ہے کہ ''آدم کے بیٹے کے پاس اگر ایک وادی (بھر مویشی) ہو تو وہ چاہے گا کہ ایک اور مل جائے اور اگر اس کے پاس دو وادیاں ہو جائیں تو چاہے گا کہ تیسری بھی ملے۔ ابن آدم کا پیٹ مٹی سے بھر سکتا ہے۔'' اس کا تعلق اسی حدیث قدسی کے پہلے ٹکڑے سے ہے، جس میں آیا ہے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے کہ ''ہم نے مال اس لیے دیا ہے کہ نماز قائم کی جائے اور زکوٰۃ ادا کی جائے۔'' (۲۳) ایک

دوسری حدیث میں آیا کہ ایک بار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک جوان آدمی کی طلب معاش کی راہ میں چستی اور پھرتی دیکھ کر یہ ریمارک پاس کیا کہ کاش یہ چلت پھرت خدا کی راہ میں ہوتی! نبی ﷺ نے فرمایا ''اگر یہ اپنے چھوٹے بچوں کے لیے تگ ودو کر رہا ہے تو یہ خدا کی راہ میں ہے اور اگر اس لیے جدو جہد کر رہا ہے کہ خود غنی ہو جائے تو بھی خدا کی راہ میں جدو جہد کر رہا ہے۔ اگر اپنے گھر والوں کے لیے یہ کوشش کر رہا ہے کہ تو بھی یہ راہ خدا میں شمار ہوگی البتہ اگر دوسروں پر بڑائی جتانے اور زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی غرض سے دوڑ بھاگ کر رہا ہے تو یہ شیطان کی راہ میں شمار ہوگی۔'' (۲۴)

دولت صرف ذاتی محرکات کے تحت نہیں کمائی جاتی نہ بچت اور سرمایہ کاری کا واحد محرک ذاتی نفع یا مستقبل میں معیار زندگی کی بلندی ہے۔ یہ تو اس مسئلے کا سطحی سرمایہ دارانہ تصور ہے، جس پر اب اس نظام کے ماہرین خود تنقید کر رہے ہیں (۲۵) انسان اجتماعی محرکات کے تحت بھی سرگرمی عمل دکھاتا ہے۔ قومی سربلندی چاہنے اور دوسری اقوام سے مسابقت کا جذبہ ہمیشہ بہت سے حوصلہ مند لوگوں کے لیے مہمیز کا کام کرتا رہا ہے اسلام نے اس فطری رجحان کو رضائے الٰہی کی خاطر مال کے ذریعے جہاد کرنے اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر وسائل مہیا کرنے کی شکل دے دی ہے۔ یہی جذبہ تھا جس نے پہلی صدی ہجری میں انسانوں کی ایک ایسی فعال جماعت پیدا کر دی جسے کوئی طاقت آگے بڑھنے سے نہ روک سکی۔

ان حقائق کی روشنی میں اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آج کے زمانے میں اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا تقاضا ہے کہ مسلمان دولت کمائیں اور اس میں سے بچا کر کچھ سرمایہ نفع آور کاروبار میں (براہ راست یا اسلامی مالیاتی اداروں کے ذریعہ) لگائیں اسلامی تحریکوں کو مسلمانوں کو ایسا کرنے کی تلقین کرنی چاہیے اور اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری اقدامات کرنے چاہئیں، کیوں کہ ''جب کسی فرض کی ادائی کے لیے کوئی کام کرنا ضروری ہو تو وہ کام بھی فرض ہو جاتا ہے۔'' (۲۶)

کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں ناخواندگی، حفظان صحت میں کمی، غربت و افلاس اور مجموعی طور پر تعلیمی اور معاشی پس ماندگی اتنے گمبھیر مسائل ہیں اور انہیں حل کرنے کے لیے اتنے زیادہ وسائل درکار ہیں کہ جو تھوڑے سے لوگ خالص دینی اور دعوتی کاموں میں مصروف ہیں ان

کے اس طرف متوجہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا البتہ دین کی تبلیغ واشاعت کا جو تھوڑا بہت کام آج ہو رہا ہے، اس میں ضرور قابل لحاظ کمی آجائے گی۔ یہ کام دراصل حکومتوں کے کرنے کے ہیں، ورنہ بڑی بڑی فلاحی تنظیموں کو ان کی ذمہ داری لینی چاہیے۔ اسلامی تحریکیں محدود افرادی طاقت اور محدود تر مالی وسائل کے ساتھ اس میں پڑ کر کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکیں گی۔

ہمیں اس خیال سے اتفاق نہیں، یہاں کام کی مقدار کا نہیں سوچنے کے انداز کا سوال ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی مقاصد کے حصول کے لیے ان کاموں کی اہمیت کا شعور عام ہو اور انہیں اولیت دی جائے۔ اسلامی تحریکیں اس شعور کو عام کرنے اور اس اولیت کا احساس دلانے میں کامیاب ہو جائیں تو باقی کام عام مسلمان خود کر لیں گے۔ لیکن اسی بات کو مؤثر طور پر ذہن نشین کرانے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی تحریکوں کے اپنے خطاب اور عملی پروگرام میں اس شعور اور اولیت کی جھلک نظر آئے۔ ساتھ ہی ابتدائی مراحل میں جمود کے شکار عوام کے سامنے کامیاب جدوجہد کے نمونے پیش کرنے ہوں گے۔ اگر وہ اس حد تک بھی اس طرف توجہ نہیں کریں گی تو رفتہ رفتہ ان کی افرادی طاقت اور مالی وسائل دونوں کم ہوتے جائیں گے۔ کیوں کہ وہ اصل منبع، یعنی عام مسلمان، ان کاموں کی طرف بے توجہی کے نتیجہ میں تیزی سے زوال کی طرف جا رہے ہیں۔ عام مسلمانوں میں اسلامی تحریکوں کی بات کو دینی اعتبار سے جو وزن حاصل ہے اس کے پیش نظر یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ان کے اس طرف توجہ کرنے اور مسلمانوں کو دولت کمانے، بچانے اور سرمایہ کاری کرنے کی تلقین کرنے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ دینی سند اور عصر حاضر میں اس عمل کی خصوصی اہمیت کے شعور کے بعد ان معاشی سرگرمیوں میں قابل لحاظ تیزی آجائے گی جو عام حالات میں انسان طبعی رجحانات کے تحت انجام دیتا ہے۔ اور ذاتی محرک کے ساتھ اجتماعی اور دینی تحرکات کا اضافے سرگرمیوں میں اضافہ کا سبب بنے گا۔

اسلام میں دین و دنیا کا امتزاج

دین سے دنیا کی دوری اور اسلامی تحریکوں کی دنیوی ترقی کے اہتمام سے دست کشی مسلمانوں کے زوال کی صدیوں کی پیداوار ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں یہ بات نہ تھی۔ نبی کریم ﷺ نے بھی معاشی قوت کو اہمیت دی اور خلفائے راشدین، صحابہ کرام اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ ہجرت نبوی ﷺ سے پہلے جب

کچھ مسلمانوں نے حبشہ میں پناہ لی تو وہاں بھی انہوں نے تجارت میں نام پیدا کیا۔ پھر جب مسلمان ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ آئے تو ان کے معاشی مسائل کو انفرادی مسئلے سمجھ کر ان پر چھوڑ دینے کی بجائے نبی ﷺ نے مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لیا، بھائی چارہ (مواخاۃ) کرایا۔ یہودیوں کے بازار سے الگ ایک نیا بازار بسایا(۲۷) اور کوئی ہٹا کٹا آدمی حاجت روائی کے لیے آیا تو اسے کلہاڑی اور رسی پکڑا کر اپنی قوت بازو سے روزی کمانے کا راستہ دکھایا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیت المال قائم کیا اور امیروں کے مال میں غریبوں کا جو حصہ مقرر ہے اس کی ادائی سے انکاری مانعین زکوٰۃ سے جنگ کر کے اس حق کو بحال کیا۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے معاشی اقدامات (۲۸) کے ذکر کے لیے تو علیحدہ مقالہ بھی کافی نہیں ہوگا۔ شاہراہیں بنانا، ان پر سرائیں تعمیر کرانا، نئے شہر بسانا۔ غرض کہ کون سا تعمیری کام ہے، جو آپ نے نہ کیا ہو۔ یہاں تک کہ مصر سے جزیرۃ العرب کو غلہ کی تیز رفتار فراہمی کے لیے ایک قدیمی نہر کی دوبارہ کھدائی، صفائی اور تعمیر نو کا اہتمام بھی کرایا۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ڈاک کا انتظام اعلیٰ پیمانے پر کیا اور نجی کاروبار پھیلانے میں لوگوں کی ہمت افزائی کی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے پر آشوب مختصر دور خلافت میں عدل و انصاف کے قیام کی کوشش کے ساتھ تعمیری کام جاری رکھے۔ یہی شان عمر بن عبدالعزیز کے دور میں بھی نظر آتی ہے۔

یہ صرف حکمرانی کے کام تھے۔ یا ان کا اسلام کے قیام و استحکام سے براہ راست تعلق تھا۔ جو لوگ اس دین کے مزاج سے واقف ہوں، ان کو اس سوال کے جواب میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے۔ یہی اسلام ہے۔ رسول خدا نے مدینہ میں مسجد بھی بنائی اور بازار بھی بسایا اور دفاع کے لیے خندق بھی تعمیر کی۔ اسلام میں ان کاموں کے درمیان تفریق نہیں روا رکھی جا سکتی کیوں کہ وہ ایک دوسرے سے مل کر ہی مکمل اسلام بنتے ہیں۔ کسی ایک کی کمزوری سے پورا اسلام کمزور ہوتا ہے اسلام کے ابدی پیغام میں عبادت اور تجارت ساتھ ساتھ شامل ہیں۔

> ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن، تو اللہ کی طرف دوڑ پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو شاید تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔'' (جمعہ:۹-۱۰)

حاشیے

(۱) فضل الرحمان فریدی۔ اشارات ''زندگی نو'' دہلی جنوری ۱۹۹۷ء جلد ۲۳ شمارہ ۱ صفحات ۸۰۲

● خرم مراد، کل کا روشن مستقبل اور آج کے سلگتے مسائل، ترجمان القرآن، لاہور، جنوری ۱۹۹۷ء، جلد ۱۲۳، عدد ۱، صفحات ۳-۱۶۔

● یوسف القرضاوی، فی فقہ الاولیات (ترجیحات کی فقہ) قاہرہ، مکتبہ وہبہ ۱۹۹۵ء

● حسن عبداللہ ترابی، تجدید الفکر الاسلامی (اسلامی فکر کی تجدید) قسنطینہ الجزائر ۱۹۹۵ء

● راشد غنوشی، اسلامی عناصر کی غیر اسلامی حکومتوں میں شرکت، (انگریزی) پاور شیرنگ اسلام (شریک اقتدار اسلام) ایڈیٹر عزام تمیمی، لندن، لبرٹی فار مسلم ورلڈ پبلی کیشنز ۱۹۹۳ صفحات ۵۱-۶۳ نیز ملاحظہ ہو ان کا انٹرویو۔ ''اللواء (عربی) ۱۳ اگست ۱۹۹۲ء صفحہ ۹۔

● مراد ہوفمان، اسلام سن ۲۰۰۰ میں (انگریزی سے عربی میں ترجمہ) مکتبہ الشروق ۱۹۹۵ء

● عبدالوہاب آفندی ''اسلامی ریاست کی ضرورت کس کو ہے۔'' ہونیڈنس این اسلامک اسٹیٹ۔ لندن، گرے سیل ۱۹۹۱ء۔

● محمد سلیم العوا، انٹرویو (عربی) المجتمع کویت، عدد ۱۲۲۸-۳۰ مارچ ۱۹۹۶ء، صفحہ ۳۶-۳۷۔

(۲) نشاۃ ثانیہ کی راہ، اسلامی تحریکوں کی بدلتی ہوئی ترجیحات ''اِنکاونٹرس (انگریزی) لسٹر۔ اسلامک فاؤنڈیشن، ستمبر ۱۹۹۵ء جلد ۱، شمارہ ۲، صفحات ۳-۲۹۔

(۳) ''پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔'' (سورۂ علق۔ آیات: ۱-۲)

(۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب کسی مقرر مدت کے لیے تم آپس میں قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔'' (سورۂ بقرہ، آیت: ۲۸۱)

(۵) چنانچہ جنگ بدر کے موقع پر متعدد قیدیوں کا فدیہ قرار دیا گیا کہ ان میں سے ہر ایک مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ تاریخی حوالوں اور مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب ''اسلام کا نظریۂ ملکیت، گیارہواں باب، صفحہ ۴۱۱-۴۱۲، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۱۹۷۸ء (طبع ۱۹۹۴ صفحات ۴۲۵-۴۲۷)

(۶) اسلام کا نظریۂ ملکیت، صفحہ ۴۱۳ (طبع ۱۹۹۴ صفحہ ۴۲۷)

(۷) یہ ایک اندازہ ہے، بعض مسلمان ممالک میں خواندگی کی شرح خاصی اونچی بھی ہے مگر متعدد اسلامی ممالک میں اب بھی بالغ افراد میں پڑھنا لکھنا جاننے والوں کا تناسب پچاس فی صد سے کم ہے۔ ذیل میں بعض ایسے ممالک کا نام لکھا جا رہا ہے۔ قوسین کے درمیان بالغ افراد میں خواندگی کی شرح ۱۹۹۳ کے اعداد و شمار کے مطابق درج کی گئی ہے۔

مصر (۲۹٫۸)، سوڈان (۲۳٫۸)، مراقش (۲۱٫۷)، یمن (۲۱٫۱) بنگلہ دیش (۳۷)، موریطانیہ (۳۶٫۷)، پاکستان (۳۶٫۲)، عمان (۳۵)، افغانستان (۲۹''٫۸) اور مالی (۲۸٫۲)

(ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹ ۱۹۹۶ء یونائیٹڈ نیشنز ڈیولپمنٹ پروگرام، نیویارک اور آکسفورڈ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۹۶ء، صفحہ ۳۵-۳۶)

(۸) پنجاب میں زراعت سے متعلق ایک حالیہ ریسرچ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابتدائی تعلیم گیہوں کی روایتی کاشت میں بھی پیداوار میں اضافہ کا سبب بن سکتی ہے۔ (پرتھا داس گپتا) خوش حالی اور خستہ حالی کے اسباب کا مطالعہ (این انکوائری انٹو ویل بینگ اینڈ ڈسٹی ٹیوشن) نیویارک، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۹۳ء، صفحہ ۹۸۔

(۹) مثال کے لیے ملاحظہ ہو، لسٹر تھورو: سرمایہ داری کا مستقبل (دی فیوچر آف کیپٹلزم) لندن، نکولا بریلی پبلشنگ، ۱۹۹۶، صفحہ ۲۸۵۔

(۱۰) مشہور ماہر معاشیات گال بریتھ کے بقول ''اس دنیا میں کوئی پڑھی لکھی آبادی ایسی نہیں جو غریب ہو اور کوئی ناخواندہ آبادی ایسی نہیں جو غریب نہ ہو۔ آبادی تعلیم یافتہ ہو تو کسی درجہ میں معاشی طور پر آگے بڑھنا لازماً واقع ہوتا ہے۔'' جان کیتھ گال بریتھ، اچھا سماج، انسانیت دوست پروگرام (دی گڈ سوسائٹی، دی ہیومین ایجنڈا) باسٹن اور نیویارک، ہوٹن مفلن کمپنی۔ ۱۹۹۶ء، صفحہ ۱۳۲۔

(۱۱) چنانچہ حال میں جن مسلمان ممالک نے قابل لحاظ ترقی کی ہے انہوں نے ازالہ ناخواندگی کی مہم چلا کر اپنی آبادی کو پڑھا لکھا بنا لیا ہے۔ ذیل میں بعض ایسے ممالک کے نام درج کیے جا رہے ہیں۔ نام کے بعد ملک میں ۱۹۹۳ء میں بالغ آبادی میں ناخواندگی کا فی صد تناسب لکھا ہے اور اس کے بعد قوسین میں یہ بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۰ء میں اس میں خواندگی کا تناسب کیا تھا۔

ملیشیا ۲ء۸۲ (۶۰)، ترکی ۱ء۸۱ (۵۳)، انڈونیشیا ۹ء۸۲ (۵۲)، (ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹ ۱۹۹۶ء، صفحہ ۲۹-۱۲۸)

(۱۲) اس بارے میں باقاعدہ اعداد وشمار جمع کرنے کا کام کم ہوا ہے۔ البتہ حال میں کے رحمٰن خان ممبر پارلیمنٹ کی نگرانی میں ''کرناٹک میں مذہبی اقلیتوں کے سماجی معاشی اور تعلیمی جائزے ۱۹۹۲ء'' کی رپورٹ سامنے آئی ہے۔ (رپورٹ آف ہائی پاور کمیٹی آن سوسیو اکونامک اینڈ ایجوکیشنل سروے آف ریلیجس مائنارٹیز ران کرناٹکا، ۱۹۹۲۔ جاری کردہ ریاستی اقلیتی کمیشن، کرناٹک، بنگلور، ۱۹۹۵ء) اس میں کہا گیا ہے ''اقلیتوں کے درمیان سب سے زیادہ ناخواندگی بدھ اور مسلم آبادی میں ہے یعنی بالترتیب ۴۸ اور ۴۷ فی صد۔'' نیز یہ کہ ''ساتویں درجہ سے آگے کی تعلیم میں سب سے پیچھے مسلمان ہیں اور سب سے آگے عیسائی۔''

واضح رہے کہ کرناٹک کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت یوپی بہار اور اڑیسہ کے مسلمانوں سے کہیں بہتر سمجھی جاتی ہے۔ شمالی ہندوستان کی متعدد ریاستوں کا ایک جامع سروے کیا جا چکا ہے۔ جس کی رپورٹ رفتہ رفتہ سامنے آرہی ہے۔ ان رپورٹوں سے بھی اسی امر کی تصدیق ہوتی ہے جس کا ذکر مقالے کی متن میں کیا گیا ہے، یعنی مسلمانوں میں ناخواندگی عام ہے اور برادران وطن سے زیادہ ہے اور عورتوں میں ناخواندگی مردوں سے زیادہ ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اعجاز الدین احمد ''ہندوستان میں مسلمان، ان کی تعلیمی، آبادیاتی اور سماجی اور اقتصادی حالت نیز ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور دوسری قوموں سے متعلق مقابلہ کے اعداد وشمار جو ۱۹۹۰ - ۱۹۹۳ میں کیے گئے ایک منفرد اور باقاعدہ سروے پر مبنی ہے زیر اہتمام ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، انٹرانڈیا پبلیکیشنز، راجہ گارڈن نئی دہلی۔

پہلی دوسری تیسری اور چوتھی جلدیں شائع ہو چکی ہیں جن کا تعلق، بالترتیب بہار، راجستھان، دہلی اور اتر پردیش (یوپی) سے ہے۔ تاریخ اشاعت بالترتیب ۱۹۹۳ - ۱۹۹۴ء - ۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۶ء، (کتاب انگریزی میں ہے، مسلمس ان انڈیا، دیر ایجوکیشنل، ڈیموگرافک اینڈ سوسیو اکونامک اسٹیٹس ودھ کمپریٹو انڈیکٹرس فار ہندوز، سکھز، کرسچینز اینڈ اور کمیونیٹیز، بیسڈ آن اے سنگولر اینڈ سسٹمیٹنک فیلڈ سروے۔ ۱۹۹ - ۱۹۹۳ء)

(۱۳) مسلم، صحیح، کتاب القدر، حدیث نمبر ۶ ۳ اور ابن ماجہ، سنن کتاب الزہد، باب التوکل والیقین، محمد فواد عبدالباقی کی تحقیق والے ایڈیشن میں حدیث نمبر ۴۱۶۸۔

(۱۴) ابن ماجہ، سنن کتاب التجارت، باب الحث علی المکاسب مذکورہ بالا ایڈیشن میں حدیث نمبر ۲۱۴۱)

(۱۵) امام مالک، مؤطا کتاب القرآن، باب ماجاء فی الدعاء حدیث نمبر ۲۷، یہ حدیث مرسل ہے۔

(۱۶) محققین کے نزدیک قحط اور بھک مری کے زیادہ تر واقعات کے پیچھے خوراک کی واقعی کمی نہیں خوراک کے محتاج افراد کے پاس قوت خرید اور استحقاق کی کمی رہی ہے ملاحظہ ہو امرتیا سین، غربت اور قحط، استحقاق اور محرومی پر ایک مقالہ (پاورٹی اینڈ فیمن۔ این ایسے آن انٹائٹلمنٹ اینڈ ڈیپریویشن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۸۱۔ خاص طور پر صفحات ۱۷، باب ۱۲۹-۵۵-۱۵۴ اور صفحہ ۱۶۱۔

(۱۷) جان کینتھ گالبریتھ، آسودگی پر مبنی طرز زندگی (وی کلچر آف کنٹنٹ منٹ) باسٹن اور نیویارک ہوٹن مفلن کمپنی، ۱۹۹۲ صفحہ ۴۴۔

(۱۸) ملاحظہ ہو سیموئل ہنٹنگٹن کا مقالہ، تہذیبوں کا ٹکراؤ (دی کلیش آف سیویلیزیشنس) جو امریکی رسالہ ''فارن افیرز'' کے شمارہ ۷۲ میں ۱۹۹۳ کے موسم گرما میں شائع ہوا تھا (صفحہ ۲۲-۴۹) اس مقالہ کے مرکزی خیال کو مصنف نے ۱۹۹۶ میں سائمن اور شسٹر کی شائع کردہ کتاب ''تہذیبوں کا ٹکراؤ اور عالمی نظام کی نئی تشکیل'' (دی کلیش آف سیویلیزشین اینڈ دی ری میکنگ آف ورلڈ آرڈر) میں تفصیل سے پیش کیا ہے۔ دنیا کی فضا کمیونزم کے زوال کے بعد سے کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ مصنف سے زیادہ ان کے پڑھنے والے اور پڑھنے والوں سے زیادہ سنی سنائی کے ذریعہ ان کے مرکزی خیال سے آگاہی حاصل کرنے والے اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ اسلام اور مغرب کا ٹکراؤ ضرور ہوگا۔

(۱۹) ''اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندر ہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تا کہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور دوسرے اعداء کو خوف زدہ کر دو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔''
(الانفال:۶۰)

(۲۰) ایک تازہ رپورٹ کے لیے ملاحظہ ہو محمد عوض ''مشرقی ترکستان میں چینی ستم کی جڑیں'' (عربی) المجتمع، کویت، عدد ۱۲۳۹-۲۵ فروری ۱۹۹۷ء-۲۴-۲۷

(۲۱) تیمور کران ''اسلام اور پسماندگی۔ ایک پرانے معمہ پر دوبارہ نظر'' اسلام اینڈ انڈر ڈیولپمنٹ، این اولڈ پزل ری ویزیٹڈ)
ورکنگ پیپر نمبر ۹۶۴۰۔ ایکونامک ریسرچ فورم برائے عرب ممالک ایران اور ترکی، صفحہ ۳، یہ مقالہ جرنل آف انسٹی ٹیوشنل اینڈ تھوریٹکل ایکونامکس کے مارچ ۱۹۹۷ء شمارہ (جلد ۱۵۳، عدد ۱) میں بھی شائع ہوا ہوگا۔

(۲۲) اوصاف احمد، ''اسلامی بنکاری، نظریاتی بنیادیں اور عملی تجربات'' اسلام آباد، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹیڈیز ۱۹۹۲ء۔
فواد عمر اور محمد عبدالحق، اسلامک بینکنگ، نظریہ، عمل اور درپیش چیلنج، (اسلامک بینکنگ، تھیوری پریکٹس اینڈ چیلنجز) کراچی آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۹۲ء۔

(۲۳) مسند امام احمد، بروایت ابی واقد الیثی، جلد ۵، صفحہ ۲۱۹، مطبعہ میمنیہ مصر، ۱۳۱۳ھ۔

(۲۴) طبرانی، المعجم الصغیر، باب من اسمہ احمد، مطبع انصار، دہلی ۱۳۱۱ھ صفحہ ۱۹۳۔

(۲۵) لسٹر تھورو، سرمایہ داری کا مستقبل (دی فیوچر آف کیپٹلزم) لندن، نیکولا بریلی پبلشنگ، ۱۹۹۶، صفحہ ۳۱۴-۳۱۸۔

(۲۶) اس اصول پر تمام فقہا اسلام کا اتفاق ہے حوالوں کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب ''اسلام کا نظریہ ملکیت'' مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۷۸ء، صفحہ ۴۲۴ (۱۹۹۴ ایڈیشن صفحہ ۴۳۸)

(۲۷) ابن ماجہ، سنن، کتاب التجارت، باب الاسواق ودخولہا، فواد عبدالباقی ایڈیشن، حدیث نمبر ۲۲۳۳۔

(۲۸) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے معاشی اقدامات کا ابن عبدالحکم کی فتوح مصر اور بلاذری کی ''فتوح البلدان'' میں اچھا ذکر آیا ہے۔ بعض مثالوں کے لیے راقم الحروف کی کتاب اسلام کا نظریہ ملکیت کے نویں اور گیارہویں باب کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے افراد کو اپنی معاشی حالت بہتر بنانے کی تاکید کی اور ان کو اس کے طریقہ بھی بتائے، فرمایا ''لوگو اپنی معاشی حالت بہتر بناؤ اس میں تمہارا بھی بھلا ہے اور دوسروں کی مدد کا بھی سامان ہے۔'' (ابوبکر بن ابی الدنیا، اصلاح المال۔ دارالوفا قاہرہ، ۱۹۹۰، صفحہ ۱۷۵، لوگوں کو فوجی خدمت کے عوض جو وظیفے جاری کیے گئے تھے۔ ان کے سلسلہ میں فرمایا ''میں جانتا ہوں کہ یہ مال ان کی ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ لوگ ایسا کرتے جب وظیفہ ملے تو اس میں سے بھیڑ بکریاں خرید کر اپنے زرخیز علاقوں میں چھوڑ دیں۔'' (بلاذری، فتوح البلدان، قاہرہ، ۱۹۳۲ء، صفحہ ۴۳۹۔ ان ہدایات میں مال کمانے، بچت کرنے، اور مال کو نفع آور کاموں پر لگانے، تینوں پر زور دیا گیا ہے۔

اسلامی نظام فکر کا متحرک مزاج

میرا موضوع ہے ''اسلام کے متحرک نظام فکر میں اجتہاد'' لیکن میں یہ نہیں بھول سکتا کہ ہم گجرات میں ہونے والے فسادات اور واقعات کی روشنی میں یہ بات کر رہے ہیں میرا خیال ہے کہ جو کچھ گجرات میں ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ مذہبی اور سماجی نہیں بلکہ سیاسی نوعیت کا حامل ہے۔ ہندوستان میں اب تک ہوئے تمام فسادات سے بالکل مختلف ہے جہاں ریاست کی پشت پناہی میں فرقہ پرست قوتوں نے مسلم نسل کشی کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ پھر ہم ''دہشت گردی'' کے خلاف جنگ سے بھی پہلو تہی نہیں کر سکتے۔ بہت سے گروہوں نے ان واقعات کی آڑ لے کر اسلام کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر رکھا ہے۔ کچھ لوگ اسلام پر طرح طرح کے سوالات اٹھا رہے؟ کچھ کہہ رہے ہیں کہ اسلامی تہذیب انسانیت کے لیے تعمیری نہیں ہے۔ ان چیزوں نے ہر جگہ مسلمانوں کو اپنے دفاع پر مجبور کر دیا ہے لیکن ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔

ہر چند کہ گجرات کے واقعات میں ہمارے لیے نئے خطرات اور نئی دھمکیاں ہیں لیکن اسی کے ساتھ بہت سے مواقع بھی ہیں۔ دوسروں کے مقابلے میں خود کو تبدیل کرنا نسبتاً زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اور یہ خوش آئند بات ہے کہ ملت کا سواد اعظم اپنی قوتوں کا جائزہ لینے، اپنے افکار کو استحکام بخشنے، مثبت رویہ اپنانے اور حالات و واقعات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ یہ سب انھیں واقعات کی دین ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ ان چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی تمام تر قوتوں کو مجتمع کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے وسائل کا مؤثر استعمال کرنا ہوگا۔ موجودہ دور میں اجتہاد کا ایک جز و اس سوال کے جواب میں بھی مضمر ہے کہ ہم اپنی قوتوں کو استحکام

کیسے بخشتے ہیں اور وسائل کا چیلنج کے مقابلے کے لیے استعمال کیسے کرتے ہیں؟ اس سوال کا جو بھی جواب ہو میں اسے اجتہاد سے تعبیر کرتا ہوں۔ اگر آپ ان سوالوں کے جواب کتابوں میں تلاش کرنا چاہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو ناکامی ہوگی کیوں کہ ان کتابوں کے لکھنے والوں کے سامنے یہ مسائل نہیں تھے۔ اگر آپ ان کے حل کے لیے قیاس سے کام لینا چاہیں تب بھی مجھے شبہ ہے کہ آپ کو زیادہ کامیابی مل سکے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ ہوا ہے وہ بالکل نئی نوعیت کا ہے۔ ۱۱ ستمبر کے واقعہ کو ہی لے لیجیے۔ اس سے پہلے کوئی اس بات کا گمان بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایک شخص کو دہشت گرد قرار دے کر ساری دنیا میں اس کی تلاش کی جائے گی اور امریکہ جیسا ملک افغانستان پر حملہ کر بیٹھے گا۔ یہ سب بالکل نئی باتیں ہیں۔

لہٰذا کسی نئی بات کا سامنا کرنا اور اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنا اور فیصلہ کرنا ہی میرے نزدیک اجتہاد ہے۔ یہ بنیادی قسم کا اجتہاد ہوگا۔ آیئے اس چیز کے لیے مطلوبہ مراحل پر غور کریں۔

پہلا مرحلہ جیسا کہ میں نے عرض کیا مسئلہ پر غور و تدبر کیجیے۔ فلاں تصنیف اور فلاں کتاب، تین ہزار سال پہلے لکھی گئی کتاب اور ایک ہزار سال پہلے لکھی گئی کتاب سے زیادہ حاصل نہیں ہوگا۔ بے شک ان میں اصول دیئے گئے ہیں اور ہمارا کام انھیں اصولوں کو یکجا کرنا اور ان سے نتیجہ اخذ کرنا ہے۔ ہر شخص کے سوچنے کا انداز جداگانہ ہے۔ اور انفرادی طور پر ہم کسی ایسے نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے جس پر ساری ملت کا اتفاق ہوجائے ہمیں اس اتفاق رائے تک پہنچنا ہے۔ اور یہ راستہ مباحثہ سے ہوکر گزرتا ہے اور اس کے لیے ایک فورم یا پلیٹ فارم کی ضرورت ہوگی۔ چاہے آپ خود کو منظم کریں یا پریس کا استعمال کریں یا انٹرنیٹ سے کام لیں آپ کو ڈائیلاگ کا راستہ اپنانا ہی ہوگا کیونکہ بہت سے لوگ آپ سے مختلف سوچتے ہوں گے۔ لہٰذا صرف ڈائیلاگ اور ڈسکشن سے ہی ہم کسی ایسے نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں جو قابل عمل ہو۔ قابل عمل سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ پھر اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں ہوگی بلکہ ہر قدم پر اصلاح کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ اس لیے تجربہ بھی اجتہاد کی اہم بنیاد ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ تجربے کے مرحلے سے فرار اختیار نہیں کرسکتے۔

مجھے اکثر اس سوال سے پالا پڑا ہے کہ اجتہاد کا تحریک اسلامی میں کیا رول ہے؟ تحریک اسلامی کا بنیادی کام دعوت ہے۔ مثلاً: ہم دعوت کے کام کی انجام دہی میں غیر مسلم لوگوں

کو مخاطب کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں تین جہات سے سابقہ پڑتا ہے: (۱) ہم خود داعی کی حیثیت سے (۲) مدعو، اور (۳) پیش کردہ دعوت تینوں کو صحیح طور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہم کون ہیں؟ کیا ہم میں دعوتی کام کی انجام دہی کے لیے مطلوبہ صفات موجود ہیں؟ اگر نہیں تو کمزوری کے پہلو کون سے ہیں؟ اگر یہ عملی کمزوری ہے تو کیا ہم مطالعہ کر رہے ہیں؟ اگر کردار کی کمزوری ہے تو کس پہلو سے؟ لوگوں سے ہمارے تعلقات اور معاملات کیسے ہیں؟

پھر آپ کو مدعوئین (جن کو دعوت پیش کی جاتی ہے) کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ وہ کون لوگ ہیں؟ ان کے مشاغل اور دلچسپیاں کیا ہیں؟ ان کے بنیادی مسائل کیا ہیں؟ کس چیز سے وہ متفکر ہیں؟ وغیرہ۔

اگر آپ ان کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے آپ کو ان کے ذہن کو پڑھنا ہوگا ان کی دلچسپیوں اور فکر کا محور تلاش کرنا ہوگا۔ یہ محور غریبی بھی ہوسکتا ہے ملک کی کمزوریوں کے تئیں ان کے احساسات بھی ہوسکتے ہیں؟ سماجی برائیوں کے خلاف ان کا ردعمل بھی ہوسکتا ہے؟ خاندانی عدم استحکام، فحاشی، منشیات اور دیگر چیزیں بھی ہوسکتی ہیں۔ غرض یہ کہ آپ کو مناسب اپروچ کی تلاش کرنا ہوگی، جس کے ذریعہ آپ انھیں مخاطب کرسکیں۔ مزید برآں آپ کا مخاطب مذہب بھی رکھتا ہے اور ثقافتی پس منظر بھی اور شاید نسلی اور قومی عصبیتیں بھی۔ ان سب امور کو بھی آپ کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔

اب دعوت کا کام کس چیز سے شروع کیا جائے؟ آپ اسلام کو اس کے کس پہلو سے پیش کریں گے؟ سیاسی پہلو سے؟ بنیادی اقدار سے؟ اخلاق و کردار سے؟ اس کی عالمگیریت اور آفاقیت سے؟ مساوات سے؟ توحید سے؟ اس سوال کا کوئی یکساں جواب نہیں دیا جاسکتا۔ ہر گروہ اور ہر فرد کو اس کا جواب خود تلاش کرنا ہے۔ یہی اجتہاد ہے اور دعوت کے کام میں بارہا اجتہادات سے سابقہ پڑتا ہے۔

اسی طرح زندگی کے دوسرے میدانوں کو لیجیے۔ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کیسے کریں کہ وہ صحیح اسلامی شعار کے ساتھ پروان چڑھیں۔ اپنی نجی زندگی کو کیسے منظم کریں؟ اپنے معاشی مسائل کو کیسے حل کریں؟ کس قسم کے سیاسی اقدامات کریں؟ اصل میں یہ سب امور اجتہاد کی شکلیں ہیں۔

جب بھی ہم لفظ اجتہاد کا استعمال کرتے ہیں تو اصول فقہ کی کتابوں والی تعریف فوراً ہمارے ذہن میں آجاتی ہے۔ ایک عام تصور ہے کہ اجتہاد علماء کے کرنے کی چیز ہے عام لوگوں کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ وہ مقلد ہیں اور ان کا کام صرف یہ ہے کہ مستند عالم سے مسئلہ کا حل پوچھیں اور وہی کریں جو وہ کہتا ہے اور جو وہ کرتا ہے۔ شاید فقہ کے کچھ بنیادی میدانوں میں یہ بات بھی صحیح ہو لیکن میں جو مثالیں دے رہا ہوں اس میں انفرادی غور و تدبر اور تبادلہ خیالات کے ذریعہ رائے عامہ ہموار کرنے کی ضرورت ہے۔

معاشیات اسلام، اسلامک فنانس اور اسلامی بینکنگ جیسی اصطلاحات سے آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ اسلامی معاشرے کے اولین دور میں جو ایک بالکل سادہ زرعی معاشرہ تھا، قرآن اور سنت کی روشنی میں راست احکامات کو مستنبط کر دیا گیا تھا۔ اس وقت معیشت بہت سادہ، اور شروعاتی دور سے گزر رہی تھی جب کہ آج کے دور اور اس دور کے درمیان نہ صرف ایک ہزار سال کا ٹکنالوجی کا گیپ ہے بلکہ یہ ٹکنالوجی ہنوز ارتقاء کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ آج کے دور میں قرآن اور سنت کے اصول کا اطلاق کرنا اور ان کو زندگی کے ہر پہلو میں داخل کرنا ہی اجتہاد ہے۔ اسلامی معاشیات کسی خاص کتاب کے خاص باب اور خاص فتوے کا نام نہیں ہے۔ آج کے دور میں اٹھائے گئے سوالات کا جواب فتووں سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً اپنی دولت کو کہاں خرچ کیا جائے؟ اپنی بچت کو کہاں جمع کیا جائے؟ دولت کی نئی شکلوں میں سے کون سی شکل شرعی نقطہ نظر سے صحیح ہے؟ یہ اور اس جیسے بہت سے سادہ نظر آنے والے سوالات کے جوابات بھی پرانی کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

چوں کہ یہ سوالات نئی نوعیت کے ہیں اس لیے ان کے لیے نئے حل تلاش کرنے ہوں گے۔ اس کے لیے ہمیں شریعت کے مقاصد اور مصالح کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ اور اس کی روشنی میں ان مسائل کا مناسب ترین حل تلاش کرنا ہوگا۔ مگر اس کے لیے بھی انفرادی کوشش ناکافی ہے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر غور و تدبر کرنا ناگزیر ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی چیز کو لاگو کرتے ہیں لیکن بعد میں اس کی خامیاں سامنے آنے لگتی ہیں ایسی صورت میں ہمیں پھر سے شوریٰ اور تجرباتی مراحل سے گزرنا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مختلف لوگ مسئلے پر مختلف رائے رکھتے ہوں جیسا کہ

اسلامی بنکنگ اور اسلامی فنانس میں ہو رہا ہے جہاں بہت سے ممالک ایک دوسرے سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔

اجتہاد کی ضرورت زندگی کے ہر شعبہ میں ہر دور میں رہی ہے۔ ہمارے مدرسوں اور اسکولوں میں پہلے سے معلوم چیزوں کے بارے میں تعلیم دی جاتی ہے اور تخلیقیت پر زور نہیں دیا جاتا۔ ندرت خیال اور دوسروں سے الگ سوچنے کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ خصوصاً مسلم حلقوں میں فلسفہ تعلیم اس مفروضے پر قائم ہے کہ سب حقائق معلوم و معروف ہیں صرف انھیں دوبارہ متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔

آپ غور کریں تو پائیں گے کہ پچھلے ۵۰ برس میں اسلامی فنانس اور بنکنگ میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہ سب قرآنی تعلیمات پر مبنی ہیں تاہم گزشتہ اسلامی دور کے مقابلے میں یہ صدفی صد نئی تبدیلیاں ہیں۔ اکثر موجود چیزوں کو اس طرح سے اکٹھا کیا جاتا ہے کہ ایک بالکل ہی الگ مجموعہ سامنے آجاتا ہے یہی حال دوسرے شعبوں کا بھی ہے۔

اسلامی تحریکات میں غیر مسلم بھائیوں کے تعاون کو تحسین کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے یہ اسلامی سیاست کے لیے ایک نئی اپروچ ہے کہ ہم خیال ہندوستانیوں کو اسلام، مسلمانوں اور ملک کی بقا کے لیے منظم کیا جائے اور یہی تحریکی حلقوں میں کیا جاتا ہے۔

اسی طرح تعلیم کے میدان میں بھی کچھ نئے طریقے ہو سکتے ہیں جن کے ذریعہ آپ اپنے بچے کو غور و تدبر کرنا سکھا سکتے ہیں۔

غریبی کو لیجیے کیوں کہ غریبی کی مثال تاریخ سے بھی ملتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کے آج کی غریبی زندگی کے ہر شعبہ میں آدمی کو معذور بنا دیتی ہے۔ ایک غریب شخص تعلیم حاصل نہیں کر سکتا اس کے پاس صحت منداور مطلوبہ صفات کا حامل شہری بننے کے لیے وسائل نہیں ہوتے اسی طرح دعوت کے کام کی انجام دہی کی صلاحیت کا فقدان بھی پایا جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہر کمزوری کی جڑ ہے لہٰذا دعوت دین کے لیے اور اسلام کو تقویت دینے کے لیے سب سے پہلا مرحلہ غریبی کا خاتمہ ہوگا۔ لہٰذا اجتہاد کے لیے یہ بھی ایک موزوں ترین مسئلہ ہے۔ اور اس پر غور و فکر

کے نتیجہ میں آپ جس فیصلہ پر پہنچیں گے ہوسکتا ہے کہ وہ امام غزالیؒ کے موقف سے مختلف ہو۔ یا ان سے پہلے کے ائمہ اور مجتہدین کے موقف سے ٹکراتا ہو۔ میں کہنا چاہوں گا کہ ماہرین معاشیات اس بات پر متفق رہے ہیں کہ جدت طرازی ترقی کی شاہراہ ہے۔ پہلے زمانے کے لوگ سمجھتے تھے کہ غیر ملکی سرمایہ اپنے ملک میں لانے سے پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ پچاس سال بعد لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جو چیز بنیادی اہمیت رکھتی ہے وہ لوگوں کا دوسرے لوگوں کے تئیں اپروچ اور مائنڈ سیٹ (mind set) ہے؟ کیا وہ سیکھنا چاہتے ہیں؟ کیا وہ خود غور کرتے ہیں؟ کیا وہ ماحول میں ڈھلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور کیا وہ تبدیلی قبول کر سکتے ہیں؟ مثال کے طور پر ترقی یافتہ مغربی ممالک کو دیکھیے۔ انھوں نے ٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ساتھ خود کو ڈھالا ہے۔ بہت سے ممالک نے صرف ان کی دی ہوئی ٹکنالوجی کی تقلید کی اور خود کوئی چیز دریافت نہیں کی یہی وجہ ہے کہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے۔ اسی چیز کو ہم اجتہاد کہتے ہیں اور ماہرین معاشیات جدت طرازی سے تعبیر کرتے ہیں۔

اپنے مسائل کے بنے بنائے جوابات مت تلاش کیجیے۔ اس احساس کے ساتھ کام شروع کر دیجیے کہ صرف آپ ہی اس مسئلہ کا صحیح حل ڈھونڈ سکتے ہیں۔ یہی امت مسلمہ کی غربت کا علاج ہوسکتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اپنے دینی اور دنیوی مسائل کے حل کے لیے اور بیرونی چیلنجز سے مقابلہ میں صف آرا ہونے کے لیے ہمیں اجتہادی اپروچ اختیار کرنا ہوگی۔ ہم قرآن اور سنت سے روشنی حاصل کریں گے اور اپنے قدیم لٹریچر اور علماء سے بھی رجوع کریں گے غرض ہر اس چیز سے جس سے استفادہ کیا جاسکے ہم ہر ممکن مدد لیں گے لیکن تدبر سے کام خود لیں گے۔ میں اس سے پہلے بھی یہ بات بارہا کہہ چکا ہوں اور پھر کہہ رہا ہوں کہ قرآن کی تفہیم کے دروازے بند نہیں ہوئے۔ پہلے کے لوگوں نے قرآن کی تشریح اپنے زمانے اور مقام کے فریم ورک کے اندر رہ کر کی اور آج کا دور بھی اسی بات کا متقاضی ہے۔

ایک اور بات جس کی یاد دہانی کرانا چاہوں گا وہ یہ کہ اس بات کو نظر انداز کر دیجیے کہ اجتہاد کے لیے خاص قابلیت مطلوب ہے۔ اب ایک سوال یہ ہے کہ آپ کہاں سے شروع کریں؟

میں کہوں گا کہ آپ اپنے گھر سے شروع کریں اپنے اسکول یا مدرسے سے آغاز کریں یا پھر اپنی تنظیم ایس۔آئی۔او۔ ہی سے اس کام کو شروع کر دیں۔ ہمیشہ تنقیدی نظر سے پرکھیے۔ پر اعتماد رہیے کہ آپ موجودہ نظام میں موجود خامیوں کو دور کر سکیں گے اور دعوت، سیاست تجارت اور معاشیات کے میدانوں میں بیش بہا اضافے کر سکیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان زاویوں سے سوچنا ہی سماج کے لیے عظیم نعمت ہوگا۔

عام طور سے لوگوں میں نفرت کا لاوا پھوٹنے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں مذہبیت کم ہوتی ہے اور وہ جذباتی نعروں سے مشتعل ہو جاتے ہیں مسلمان بھی ان سے مبرّا نہیں ہیں۔ وہ غیر حقیقی طور پر ہندو انڈیا، یا مسلم انڈیا کے نعروں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ محسوس حقیقتوں کو بھی دیکھ نہیں پاتے۔ یہ ملک مختلف مذاہب، نسلوں اور رنگوں کا ملک ہے اس ملک میں برابری کے حقوق اور سب کے لیے یکساں مواقع مہیا کرانے کے سوا دوسری نجات کی راہ نہیں ہے۔ سب کو حق ہے کہ وہ خواہ کسی بھی مذہب کو قبول یا رد کریں۔ اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں۔ اور ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ دوسروں کے ذریعہ سمجھائے گئے راستے اپنائے یا چھوڑے۔ ۵۰ برس پہلے ہم نے اسی خواب سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا لیکن اسے ہماری بدنصیبی کہیے یا ہماری غفلت کہ اقتدار پر غلط قسم کے لوگ قابض ہوتے رہے اور اپنے اقتدار کا استعمال ملک اور مسلمانوں کے خلاف کرتے رہے اور ہمیں آج کا دن دیکھنا پڑا۔ میں اللہ کی ذات سے پر امید ہوں کہ اگر ہم حوصلے نہ ہاریں اور موجودہ حالات میں مناسب کام کرتے رہیں تو ہمیں مایوسی نہیں ہوگی۔

بدقسمتی سے کچھ لوگ خوف زدہ ہیں اگر ہم اللہ کے رحم و کرم اور عفو کی صفات پر اعتماد رکھیں اور عدل و انصاف کا دامن نہ چھوڑیں اور اجتہاد کا راستہ اپنائیں تو اس کے انعام سے محروم نہ رہیں گے۔ ہمیں خاص طور پر دعوت کے میدان میں جری ہونے کی ضرورت ہے۔

جہاد، اجتہاد اور مجاہدۂ نفس

مومن کی زندگی کے تین باہم مربوط پہلو

جہاد، اجتہاد اور مجاہدۂ نفس اردو، عربی اور دیگر اسلامی زبانوں میں کثرت سے استعمال ہونے والے الفاظ ہیں۔ تینوں کی جڑیں ایک ہیں۔ عربی میں ج.ہ.د. تین حروف مل کر ''کوشش'' کا مفہوم دیتے ہیں۔ اس مفہوم میں ''جدوجہد'' بھی ایک کثیر الاستعمال لفظ ہے، جس میں محنت کا پہلو زیادہ ابھرا ہوا ہے۔

اس مقالہ میں ہماری کوشش یہ ہوگی کہ پہلے ان تینوں اصطلاحات کے معنی الگ الگ متعین کریں۔ پھر دیکھیں کہ ان میں آپس میں کیا ربط ہے اور کس طرح یہ ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں اور ایک دوسرے سے الگ رہ کر ان میں کیا کمزوری آتی ہے۔ اس اصولی گفتگو کے بعد ہم بتائیں گے کہ اسلام کے عہد زریں میں جہاد، اجتہاد اور مجاہدۂ نفس کی طرف ایک ساتھ توجہ پائی جاتی تھی جس کے اثر سے مسلمانوں کی دینی اور دنیوی ترقی ہوئی مگر رفتہ رفتہ یہ ہونے لگا کہ کوئی جہاد کی طرف چلا، کوئی مجاہدۂ نفس میں اختصاص کر بیٹھا اور کسی نے اپنا کام صرف اجتہاد کرنا سمجھا۔ رہے عام مسلمان تو وہ تینوں ہی سے عزلت برتنے لگے۔ نہ جہاد رہا، نہ اجتہاد، نہ مجاہدۂ نفس!

آخر میں ہم یہ بتائیں گے کہ گزشتہ چند صدیوں سے مسلمان جس زوال کا شکار ہیں، اس میں جہاد، اجتہاد اور مجاہدۂ نفس کی طرف سے ان کی غفلت کو بڑا دخل ہے، اور اب اصلاح حال کی جو کوششیں کی جارہی ہیں، ان کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ حیات مومن میں جہاد، اجتہاد اور مجاہدۂ نفس۔ تینوں کو ان کے اصل مقام پر واپس لایا جائے۔

جہاد

جہاد کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس وسیع مفہوم میں اللہ کی راہ میں کی جانے والی ہر طرح کی کوشش شامل ہے چاہے اس کا تعلق ہمارے داخل سے ہو یا خارج سے۔ اس میں ہم اپنی زبان سے کام لیں یا جسمانی طاقت سے یا مال و جاہ سے۔ اس وسیع مفہوم کے اعتبار سے ''اجتہاد'' اور ''مجاہدۂ نفس'' بھی جہاد میں شامل ہے۔ لیکن اس مقالہ میں ہم جان و مال کے ذریعہ کیے جانے والے جہاد پر توجہ مرکوز کریں گے جو اکثر جنگ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ درج ذیل آیات قرآنی میں ایسے جہاد فی سبیل اللہ کے وسائل اور مقاصد کی نشان دہی کی گئی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۙ

(الصف: ۱۰-۱۲)

''اے ایمان والو! کیا تمہیں میں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے؟ وہ تجارت یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے بہترین کام ہے اگر تم جانو۔''

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ (الحج: ۳۹-۴۰)

''جن لوگوں سے جنگ کی جا رہی ہے، انھیں لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیوں کہ ان پر ظلم ہوا ہے۔ اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بے قصور نکالے گئے ہیں۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ یہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتے تھے۔''

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ

وَّاجۡعَلۡ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ نَصِيۡرًا ۝ (النساء:۷۵)

''تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے؟ جو کہتے ہیں کہ اے خدا! ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم و جفا کار ہیں، اور ہمارے لیے خاص طور پر اپنی طرف سے ایک محافظ و مددگار مقرر فرما۔''

جہاد کے آداب اور شرائط

مقاصد اور وسائل کی نشان دہی کے ساتھ اسلام نے ہمیں جہاد کے آداب وشرائط سے بھی آگاہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ کن حالات میں جہاد کرنا ضروری ہے۔ ان موضوعات پر کافی لٹریچر موجود ہے جس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔(۱) یہاں ہم تفصیل میں جائے بغیر بعض ضروری باتوں کا ذکر کریں گے۔

پہلی بات یہ کہ جہاد بمعنی قتال ہر زمانہ اور ہر علاقہ میں پیش آنے والی سرگرمی نہیں ہے۔ چناں چہ خود نبی اکرم ﷺ نے نبوت پر سرفراز ہونے کے پندرہویں سال تک یہ طریقہ اختیار نہیں کیا۔ مکہ میں جو تیرہ سال آپ نے گزارے، ان میں فتنہ، اور صدعن سبیل اللہ یعنی لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے روکنے کے لیے ان پر ظلم وستم ڈھانے اور اللہ کی راہ سے روکنے کی ہر ممکن تدبیریں کرنے کے جرائم سامنے آچکے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے لڑنے کی اجازت اس وقت دی جب کفار نے یہ سب کچھ کرنے کے ساتھ عملاً حملہ بھی کردیا، جیسا کہ سورۂ حج کی مذکورہ بالا آیات سے واضح ہے۔ دریں اثنا مسلمان مدینہ میں سیاسی طور پر ایک مستقل وجود اختیار کرچکے تھے جس میں فیصلہ کی باگیں نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں میں تھیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جہاد بمعنی قتال کا فیصلہ انفرادی طور پر نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمانوں

---

(۱) مثال کے طور پر، ملاحظہ ہو سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ: الجہاد فی الاسلام، دہلی، ۱۹۹۵ء، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، اور سید جلال الدین عمری: جہاد اور اس کی اقسام، جہاد اور شرائط جہاد، اور جہاد کے بعض احکام، یہ تینوں مقالے مجلہ تحقیقات اسلامی، علی گڑھ کے اکتوبر- دسمبر ۲۰۰۱ء (جلد: ۲۰، شمارہ: ۴)؛ جنوری- مارچ ۲۰۰۲ء (جلد: ۲۱، شمارہ: ۱) اور اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۲ء (جلد: ۲۱، شمارہ: ۴) میں شائع ہوئے ہیں۔

عربی میں محمد سعید رمضان البوطی کی الجہاد الاسلامی بھی قابل مطالعہ ہے۔

کی اپنی حکومت ہو تو یہ فیصلہ صرف حکومت کر سکتی ہے۔ کوئی اور صورت حال ہو تو یہ فیصلہ متعلقہ مسلمانوں پر مشتمل کسی ایسی اتھارٹی کی طرف سے کیا جانا چاہیے، جسے علم دین، اور مسلمانوں کے مفادات و مصالح کے شعور اور لحاظ - دونوں اعتبار سے ان مسلمانوں کے درمیان سند حاصل ہو۔

جس صورت حال سے ہم آج کل گزر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ساٹھ فی صد مسلمان زیادہ تر غیر جمہوری مسلم اکثریت کے ممالک میں رہتے ہیں اور چالیس فی صد مسلمان بڑی، چھوٹی اقلیتوں کی شکل میں، زیادہ تر جمہوری ممالک میں رہتے ہیں۔ اسرائیل کے قیام اور اس کی مسلسل جارحیت کے نتیجہ میں مسجد اقصیٰ کے تحفظ اور فلسطین کو اس کا حق دلانے کے لیے جہاد کی مشروعیت کے علاوہ جہاد کی ضرورت کا احساس زیادہ تر کسی خاص علاقہ میں پیدا ہوتا رہا ہے مثلاً کشمیر، چیچنیا، فلپین کے ''مورو'' علاقے، وغیرہ۔ تمام مسلمان حکومتیں مجلس اقوام متحدہ کی رکن اور متعدد دوسرے معاہدوں کی پابند ہیں اور دوسرے ملکوں میں بسنے والے مسلمان ان ملکوں کے شہری ہیں اور متعلقہ معاہدوں کے پابند ہیں۔ ایسی صورت میں جہاد کی ضرورت کی تشخیص کون کرے؟ جہاد کرنے کا فیصلہ کس اتھارٹی کو ہے؟ اور مذکورہ بالا معاہدوں اور عہد ناموں کے ہوتے ہوئے اس کی شکل کیا ہوگی؟ ایسے امور ہیں جن پر نہ ٹھیک سے غور ہوا ہے، نہ باقاعدگی کے ساتھ کوئی فیصلہ ہوا ہے۔ یہ صورت حال اطمینان بخش نہیں ہے کہ انفرادی فتاویٰ کی بنیاد پر کوئی اجتماعی پالیسی اختیار کر لی جائے۔ فلسطین کا مسئلہ بلاشبہ ایک خصوصی استثنائی حیثیت رکھتا ہے، اس پر اجتماعی غور بھی ہوا ہے اور کچھ فیصلوں کو سند قبول بھی حاصل ہے۔ مگر جہاد فلسطین کب کیا شکل اختیار کرے۔ یہ مسئلہ ہمیشہ غور طلب رہتا ہے۔

حال میں عراق پر امریکہ اور برطانیہ کے ناجائز حملہ کے ضمن میں بھی مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جانے کے جو فتوے صادر ہوئے، انھوں نے بہتوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا ان فتوؤں کی پشت پر صحیح اجتہاد موجود ہے یا کیا اس اجتماعی مسئلہ پر اجتماعی غور و فکر کا حق ادا کیا گیا ہے، کیا عام مسلمانوں کو فن جنگ کے اس دور میں جنگ بمعنی قتال کی ندائے عام دے کر محاذ پر بھیجنا حکمت کے مطابق ہے[1]؟

---

(۱) اسی طرح کی ایک تحریر کے لیے ملاحظہ ہو عربی روز نامہ ''الحیات'' میں اپریل ۲۰۰۳ء کے کسی شمارہ میں عصام العریان کا مضمون۔ عصام، اخوان کے لیڈروں میں سے ہیں اور مصری پارلیمنٹ کے ممبر رہ چکے ہیں۔

اللہ کی راہ میں کی جانے والی جنگوں میں بھی غیر متحارب لوگوں کو دانستہ نشانہ بنانا، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، معذور اور بیمار افراد کو مارنا، مفیدِ انسانیت تنصیبات کو برباد کرنا، کھیت، باغ وغیرہ کو تاراج کرنا... اسلام کے خلاف ہے۔ اس سلسلہ میں متعدد احادیث آئی ہیں جن کا مطالعہ مذکورہ بالا کتابوں کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم صرف وہ آیات قرآنی نقل کر رہے ہیں جو بتاتی ہیں کہ انسانی زندگی، اللہ کی دین ہے جس کی حفاظت لازم ہے اور اس کو ضائع کرنا بڑا جرم ہے۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ ج کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا م بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ط وَ مَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ط (المائدہ:۳۲)

''اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا؛ اور جس نے کسی کو زندگی بخشی، اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔''

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط (بنی اسرائیل:۳۳)

''اور قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔''

اجتہاد

جس طرح جہاد کا تعلق بنیادی طور پر جان و مال سے ہے، اسی طرح اجتہاد کا تعلق بنیادی طور پر ذہن وفکر اور تخیل سے ہے۔ جہاد میں جان و مال کے ذریعہ کوشش کی جاتی ہے؛ اور اجتہاد میں عقل وخرد کے ذریعہ۔

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ ط قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز وَ اِثْمُهُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ط وَ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ق قُلِ الْعَفْوَ ط کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ ۙ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ط (البقرہ:۲۱۹-۲۲۰)

''پوچھتے ہیں، شراب اور جوے کا کیا حکم ہے؟ کہو، ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی

ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔ پوچھتے ہیں: ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے شاید کہ تم غور کرو دنیا اور آخرت دونوں کے معاملات میں...''

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝ (ص:۲۹)

''یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبیؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل وفکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔''

نکاح وطلاق اور خاندانی زندگی سے متعلق احکام وہدایات پر مشتمل درجنوں آیات کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝ (البقرہ:۲۴۲)

''اسی طرح اللہ اپنی آیتوں کی تمہارے لیے وضاحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔''

تفکر، تدبر اور تعقل سے متعلق آیات قرآنی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی پہچان کے لیے بھی ان کی بڑی اہمیت ہے اور ایمان لانے کے بعد احکام الٰہی کو سمجھنے، ان کی تعمیل کرنے اور ان کی تطبیق میں بھی ان کی ضرورت ہے۔

اجتہاد کا علم سے گہرا رشتہ ہے۔ علم، پیغام حق کو پہنچانے میں بھی کام آتا ہے، اور علم ہی کے ذریعہ سے موقع کی مناسبت سے اللہ کی مرضی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

وَ يَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَ يَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۝ (سبا:۶)

''(اے نبیؐ) علم رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، وہ سراسر حق ہے اور خدائے عزیز وحمید کا راستہ دکھاتا ہے۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَ اِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ

وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ۝ (المجادلۃ:۱۱)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم سے کہا جائے کہ اپنی مجلسوں میں کشادگی پیدا کرو تو جگہ کشادہ کر دیا کرو، اللہ تمھیں کشادگی بخشے گا۔ اور جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔ تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے، اللہ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کو اس کی خبر ہے۔''

علم حاصل کرنا، غور و فکر کرنا اور تدبر کرنا، نتائج نکالنا اور نئے حالات پر ان کو منطبق کرنے کے لیے ''اجتہاد'' کرنا ایک ہی عمل کی کڑیاں ہیں۔ قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عمل کا آغاز پڑھنے یعنی علم حاصل کرنے سے ہوتا ہے:

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ اِقۡرَاۡ وَ رَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۙ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ؕ (العلق:۱-۵)

''پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔''

اصل علم زمان و مکان اور اَعداد و مقادیر سے بلند ہے جب کہ عملی زندگی میں زمان و مکان اور اعداد و مقادیر کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ اجتہاد کا کام ہے کہ وہ اصل علم سے ایسے ایجنڈے برآمد کرے جو زمان و مکان کی قید میں برتے جا سکیں۔ علم دائمی ہے، اجتہاد اس کا وہ سایہ ہے جس کے تلے ہمارا حاضر پروان چڑھتا ہے اور روزمرہ زندگی گزرتی ہے۔ علم ایک ہے مگر اس کے سائے بدلتے رہتے ہیں۔

جس طرح علم، دین و دنیا اور غیب و شہود - دونوں کو محیط ہے اسی طرح اجتہاد بھی امور دین اور امور دنیا - دونوں میں مطلوب ہے اگرچہ ہر دائرہ میں اس کا فیض الگ ہے۔ ایک پر نجات اخروی کا دارومدار ہے تو دوسرے پر دنیا میں ترقی اور کامرانی کا۔ لیکن دین ہو یا دنیا - دونوں سے متعلق امور میں اجتہاد کے سوتے ایک ہیں۔ علم دین ہو یا علم دنیا - دونوں کی جڑیں علم الٰہی کے ازلی اور ابدی سرچشمہ میں پیوست ہیں اگرچہ استفادہ کے طریقے الگ الگ ہیں۔

دنیوی امور میں اجتہاد، اس صورت میں زیادہ اہم ہوجاتا ہے جب اس سے دینی مقاصد کا حصول وابستہ ہو مثلاً: سمت قبلہ جاننے کے لیے کسی آلہ کی ایجاد، اوقات نماز کی تحقیق میں علم الافلاک سے مدد لینا اور گھڑی کا استعمال، اسلام اور مسلمانوں کے دفاع کے لیے کسی نئی تکنیک کا استعمال (جیسے عہد نبویؐ میں خندق کھودنے کا طریقہ اختیار کرنا)۔ اسی طرح دینی امور میں اجتہاد دنیوی سہولت کا سبب بنتا ہے جیسے موزوں پر مسح، جمع بین الصلاتین، اسلامک انشورنس۔

عملی زندگی میں، 'دینی' اور 'دنیوی' کی تقسیم، سفید و سیاہ کی طرح کرنا ممکن نہیں ہے۔ بہت سے امور دنیا دینی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں اور بعض امور دین، دنیوی طور پر افراد اور قوموں کی شناخت (Identity) اور بقاء و ترقی کے لیے شرط لازم کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں، بنا بریں، دنیوی اور دینی اجتہاد اکثر ملے جلے پائے جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال تعلیمی نظام ہے جس میں سلیبس (مواد تعلیم) اور طریقہ تدریس سے لے کر مدرسہ، کالج اور یونیورسٹی کی عمارت اور ان سے وابستہ فنی سہولتوں، سبزہ زاروں، باغات... سب کی اہمیت ہے۔ تعلیم کا مادی ماحول، طالب علم کی ذہنی کیفیت اور جذباتی ساخت کی تشکیل میں حصہ لیتا ہے جس کا اثر مقاصد تعلیم کے فہم و انجذاب پر پڑتا ہے۔

اجتہاد کا مقصود فرد و اجتماع کی نسبت سے مقاصد شریعت کی تحصیل و تکمیل ہے۔ چوں کہ مقاصد شریعت، دینی اور دنیوی - دونوں کو محیط ہیں (جن کی مختصر فہرست دین، جان، عقل، نسل اور مال کا تحفظ ہے) اس لیے اجتہادی سرگرمی دنیوی اور دینی - دونوں طرح کے امور میں مطلوب ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے جہاد، اجتہاد اور مجاہدۂ نفس کے باہم مربوط کرداروں پر دوبارہ نظر ڈال لی جائے۔ جب خارج کی دنیا ہمارے تصور حیات پر حملہ آور ہوتی ہے، یا اس کے لیے سازگاری میں مزاحمت کرتی ہے تو ہمیں جہاد کرنا پڑتا ہے تاکہ داخل کے تقاضے بلا روک ٹوک پورے ہوسکیں۔ اجتہاد، خارج میں داخل کے تقاضوں کی تکمیل کی شکلیں بتاتا ہے تاکہ داخلی رجحانات زمان و مکان کی قید میں اپنا مکمل اظہار کرسکیں۔ جہاد کو مادی رکاوٹوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اجتہاد کو فکر و تخیل کی دنیا میں جستجو کرنی پڑتی ہے۔ جہاد، تدبیر چاہتا ہے جب کہ اجتہاد، تدبر کے سہارے چلتا ہے۔ رہا مجاہدۂ نفس تو اس کے ذریعہ بندہ اپنے داخل کو اخلاص اور یکسوئی کے

ساتھ جہاد و اجتہاد کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے تیار کرتا ہے۔ تینوں سرگرمیاں ہر فرد مومن سے مطلوب ہیں کیوں کہ ان کے بغیر اسلامی زندگی مکمل نہیں ہوسکتی۔

اجتہاد کے مختلف دائرے

انسانی زندگی بڑی پہلو دار ہے۔ انفرادی اور اجتماعی، مقامی، قومی اور بین الاقوامی، وقتی اور مستقل... اس کے وہ مختلف دائرے ہیں جن کی مناسبت سے مطلوبہ اجتہاد کو بھی الگ الگ قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے ادب میں اجتہاد کو عموماً فقہ یا اسلامی قانون سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ فقہی اجتہاد بڑا اہم ہے مگر اسلام میں اجتہاد، معروف فقہی مسائل تک محدود نہیں۔

اجتہاد کا ایک اہم دائرہ، دین کی دعوت سے متعلق ہے جو معروف فقہ کی کتابوں میں کم ہی زیر بحث آتا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿١٢٢﴾ (التوبہ:۱۲۲)

''اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے۔ مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقہ کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے!''

کی تفسیر میں سید قطبؒ لکھتے ہیں:

''یہ دین ایک حرکی طریق کار ہے۔ اس کا فہم اسی کو حاصل ہوسکتا ہے جو اس کو لے کر حرکت میں آئے۔ وہ لوگ جو اس کی خاطر جہاد کے لیے نکلتے ہیں، وہی اس کو سمجھنے میں سب سے آگے رہیں گے...

تجربے بھی یہی بتاتے ہیں کہ جو لوگ اس دین کی تحریک سے وابستہ نہیں ہوتے وہ اس کو نہیں سمجھ پاتے چاہے وہ کتابوں کے ذریعہ اس کے مطالعہ-ٹھنڈے، بے جان مطالعہ- میں کتنا ہی وقت لگائیں...

اس دین کی فقہ، حرکت کی سرزمین میں ہی پیدا ہوتی ہے۔

...فقہ اسلامی، تحریک اسلامی کی پیداوار ہے۔ پہلے دین آیا، تب فقہ آئی، اس کے برعکس نہیں ہوا۔'' (سید قطب: فی ظلال القرآن، جلد: ۱۱، صفحہ: ۷۳-۷۴، طبع: خامس، ۱۹۶۶ء)

خود معروف معنی میں فقہی اجتہاد کے بھی مختلف دائرے اور درجے ہیں جن کی نسبت سے اجتہاد کے آداب وشرائط میں فرق کیا جاسکتا ہے۔ جن امور کا تعلق گناہ وثواب سے ہے، ان میں بھی بعض ایسے ہوسکتے ہیں جن میں آخری فیصلہ متعلق فرد ہی کرسکتا ہے۔ جیسا کہ ذیل کی حدیث سے واضح ہوتا ہے:

عن وابصة بن معبد الأسدی، أن رسول الله ﷺ قال لوابصة: جئت تسأل عن البر والإثم؟ قال، قلت: نعم. قال: فجمع أصابعه و ضرب بها صدره و قال: استفتِ قلبک یا وابصة، ثلاثاً۔ البر ما اطمأنت إليه القلب؛ والإثم ما حاک فی النفس و تردد فی الصدر و إن افتاک الناس وافتوک۔

(سنن دارمی، کتاب البیوع، جلد: ۲، ص: ۲۴۶، طبع قاہرہ، ۱۹۷۸ء)

''وابصہ بن معبد الاسدی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وابصہ سے کہا: اے وابصہ تم نیکی اور بدی کے بارے میں پوچھنے آئے ہو؟ (وابصہ نے) کہا، میں نے کہا: ہاں۔ (یہ سن کر) آپؐ نے اپنی انگلیاں یکجا کر کے اپنے سینے کو ٹھونکا اور فرمایا: اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھو۔ آپ نے تین بار یہ کہا۔ ''نیکی وہ ہے جس پر طبیعت کو اطمینان ہوجائے اور جس پر دل ٹھک جائے۔ بدی وہ ہے جو جی میں کھٹکے اور جس پر بار بار خلش ہو چاہے لوگ تجھے کوئی بھی فتویٰ دیں۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی عام فرد کے سامنے جب اس کی نجی زندگی سے متعلق یہ سوال آئے کہ اچھا کیا ہے، برا کیا ہے تو جواب کی تلاش میں خود اس کا بھی ایک کردار (Role) ہے۔ وہ ہر حال میں دوسرے کے فتووں کا ایک منفعل مستفتی (Passive Recipient) نہیں۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ منطقی استدلال اور حسابی انداز فکر اس طرح کے سوالات کے جواب تلاش کرنے کا واحد طریقہ نہیں ہے بلکہ انسان میں براہ راست جواب تک پہنچ جانے کا ملکہ بھی

ودیعت کیا گیا ہے۔ عملی زندگی میں اس ملکہ کے استعمال کی ضرورت عام افراد کو بھی پیش آسکتی ہے اور انھیں ایسا ہی کرنا چاہیے، جیسا کہ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے:

عن ابی الجوزاء السعدي، قال قلت للحسن بن علی: ما تحفظ من رسول الله ﷺ؟ قال سأله رجل عن مسألة لا أدری ما هی۔ فقال: د ع ما یریبک إلی مالا یریبک۔

(سنن دارمی، کتاب البیوع، جلد: ۲، ص: ۲۴۵، طبع قاہرہ، ۱۹۷۸)

''ابو جوزاء سعدی سے روایت ہے کہ انھوں نے حسن بن علیؓ سے پوچھا کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ کی (فرمائی ہوئی) کیا بات یاد ہے؟ انھوں نے کہا، ایک آدمی نے آپؐ سے ایک بات پوچھی، مجھے یاد نہیں وہ کیا بات تھی، تو آپؐ نے فرمایا: جو بات جی میں کھٹک رہی ہو اسے چھوڑ دو اور وہ کرو جس میں تردد نہ ہو۔''

فقہی اجتہاد

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا، ہمارے ادب میں اجتہاد کا ذکر زیادہ تر شرعی احکام کے سیاق میں آیا ہے۔ جیسا کہ تاریخ کے ہر طالب علم کو معلوم ہے۔ طہارت، نماز، روزہ، نکاح، طلاق وغیرہ جیسے مسائل میں اجتہادی کام بڑی حد تک پہلی چار صدیوں میں مکمل ہو گیا تھا۔ البتہ بدلے ہوئے حالات میں زکات سے متعلق مسائل اور رویت ہلال سے متعلق بعض امور پر غور وفکر کا سلسلہ جاری ہے۔ معاملات کے باب میں بھی ابتدائی چار صدیوں کے بعد عرصہ تک کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی مگر گزشتہ صدی میں بہت سے نئے مسائل آگئے اور اب ان کی تعداد بڑھتی ہی جارہی ہے۔ چناں چہ ہر طرف سے نئے اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا جارہا ہے۔ اس سلسلہ میں متعدد علاقائی اور بین الاقوامی مجالس کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے جو نئے پیش آمدہ مسائل پر غور وفکر کے بعد قرار دادیں منظور کرتی ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں اسلامی ملکوں کی تنظیم، تنظیم اسلامی کانفرنس (OIC) کے زیر سرپرستی قائم ہونے والی، اسلامک فقہ اکیڈمی ہے جس کا صدر دفتر جدہ میں ہے۔ اب اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ اجتہاد کا وہ دروازہ جو عام خیال کے مطابق چند صدی پہلے بند ہو چکا تھا، دوبارہ کھل گیا ہے۔

لیکن مسلمانوں کے علمی حلقے اور ان کے عوام اب بھی زمانے کے ان تقاضوں کے مطابق ردعمل سے قاصر ہیں جن کو سمجھ کر علامہ اقبالؒ نے اپنے مشہور لیکچر میں یا مولانا مودودیؒ نے ''تجدید واحیاء دین'' میں آواز بلند کی تھی۔ مولانا مودودیؒ ''کارِ تجدید'' کے مختلف شعبے گناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اجتہاد فی الدین، یعنی دین کے اصول کلیہ کو سمجھنا، اپنے وقت کے تمدنی حالات اور ارتقاء تمدن کی صحت کا اسلامی نقطہ نظر سے صحیح اندازہ لگانا اور یہ متعین کرنا کہ اصول شرع کے ماتحت پرانے متوارث نقشے میں کس طرح ردوبدل کیا جائے جس سے شریعت کی روح برقرار رہے، اس کے مقاصد پورے ہوں، اور تمدن کے صحیح ارتقاء میں اسلام، دنیا کی امامت کر سکے۔''
>
> (تجدید واحیاء دین، ص: ۴۳، طبع رام پور، مکتبہ جماعت اسلامی ہند)

علامہ اقبال کی نظر دینی ہدایات کی روشنی میں کار دنیا چلانے کے مسئلہ پر زیادہ تھی۔ چناں چہ انھوں نے اجتماعی اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا اور اس ضمن میں منتخب مجالس کے کردار (Role) کی نشان دہی کرتے ہوئے ''فقہی مکاتب فکر کے انفرادی نمائندوں سے اجتہاد کا کام مسلمانوں کی منتخب مجلس قانون ساز کی طرف منتقل کرنے'' کی تجویز پیش کی ہے۔

(Reconstruction Religous Thought in Islam, P. 174, Lahore. 1968)

انھوں نے امید ظاہر کی تھی کہ اس طرح اسلام کی اصل حرکی روح بیدار ہو جائے گی۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو نتیجہ علامہ اقبالؒ یا مولانا مودودیؒ دیکھنا چاہتے ہیں، وہ مسلمانوں کے موجودہ ماحول میں کیسے رونما ہو سکتا ہے۔ ہمارے مدرسوں اور دینی درس گاہوں میں تعلیم و تدریس کا انداز اب بھی ایسا نہیں ہے جس سے سوال کرنے والے، سوالات کے نئے جواب تلاش کرنے والے، موجودہ جوابات پر تنقیدی نگاہ ڈالنے والے اور اختلاف رائے کے باوجود صبر وتحمل کے ساتھ باہم تبادلہ خیال کرنے والے علماء ومفکرین پیدا ہو سکیں۔ ہمارے ماحول پر غیر معمولی احتیاط اور تحفظ کا دور دورہ ہے جس کا ایک شاخسانہ عدم رواداری اور اختلاف برداشت نہ کر سکنا ہے۔ تقلید کا جو مزاج صدیوں میں بنا ہے، اس نے ہر نئی بات کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی کر دیا ہے۔ دین تو دین، دنیا کے معاملے میں بھی لوگ امریکہ اور جاپان کی نقل تو اطمینان سے کر لیتے ہیں مگر خود کوئی نئی راہ نکالنے کی ہمت نہیں کر پاتے۔ جیسے ہمیں اپنی عقل وخرد پر بھروسہ نہ

رہ گیا ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہم اس امت کے افراد ہیں جس میں تقریباً ۲۸ سال کی عمر میں معاذ ابن جبل نے اُس خود اعتمادی کا اظہار کیا تھا جو ذیل کی حدیث کے مطالعہ سے سامنے آتی ہے:

حدثنا حفص بن عمر عن شعبة عن ابن عون عن الحارث بن عمرو بن أخی المغيرة بن شعبة عن أناس من أهل حمص من أصحاب معاذ (بن جبل) أن رسول الله ﷺ لما أراد ان يبعث معاذاً إلى يمن قال: كيف تقضى إذا عرض لک قضاء؟ قال: أقضى بكتاب الله۔ قال: فإن لم تجد فی كتاب الله؟ قال: فبسنة رسول الله ﷺ۔ قال: فإن لم تجد فی سنة رسول الله ﷺ ولا فی كتاب الله؟ قال: أجتهد رأيی ولا آلو۔ فضرب رسول الله ﷺ صدره و قال: الحمد لله الذی وفق رسول رسول الله لما يرضی رسول الله۔

(ابو داؤد، سنن، کتاب الاقضیة، باب اجتهاد الرای فی القضاء، طبع بیروت، دار الفکر، جلد: ۳، ص: ۲۰۱، تحقیق محمد محی الدین حمید، حدیث نمبر: ۳۵۹۲)

''.....حمص کے رہنے والے، معاذ بن جبل کے ساتھیوں سے روایت کی گئی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے معاذ کو یمن بھیجنا طے کیا تو فرمایا: جب کوئی معاملہ تمھارے سامنے آئے گا تو فیصلہ کیسے کرو گے؟ وہ بولے: میں اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اگر اللہ کی کتاب میں تمھیں (اس کا جواب) نہیں ملا تو؟ (معاذ نے) کہا: پھر اس کے رسول کی سنت کے مطابق (فیصلہ کروں گا)۔ آپؐ نے پوچھا: اگر تمھیں اللہ کے رسول کی سنت میں بھی جواب نہ ملا اور اللہ کی کتاب میں بھی نہیں ملا تو کیا کرو گے؟ (معاذ) بولے: پوری کوشش کر کے رائے قائم کروں گا، اور کوشش میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑوں گا۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے اپنے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا: شکر ہے اس خدا کا جس نے اللہ کے رسول کے پیغام بر کو اس طریقہ کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے۔''

زندگی ایک اکائی ہے۔ ایک گوشے میں اندھیرا، ایک میں اجالا۔ یہ زندگی کے مزاج کے خلاف ہے۔ مدرسوں، گھروں، دینی جماعتوں... میں تقلید اور صرف ''سنو اور بات مانو'' پر زور دیں اور چاہیں کہ صنعت و حرفت اور تجارت میں یا سائنس اور ٹکنالوجی میں مسلمان نئی نئی راہیں نکالیں، نئی ایجادات کریں... ایسا نہیں ہوگا۔ حال یہ ہے کہ ایک داعی اور مصلح اٹھتا ہے اور اپنے ماحول کے مطالعہ کے بعد، ایک نئی راہ کے طور پر، ایک چند نکاتی تحریک چلاتا ہے جو اُس مخصوص ماحول میں، مقاصد شریعت کے حصول اور دعوت اسلامی کے فروغ کے لیے بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ مگر ستر پچہتر سال بعد بھی وہ تحریک بالکل مختلف حالات میں بھی ان چند نکات سے تجاوز کی ہمت نہیں رکھتی۔ دین کی دعوت کے باب میں یہ حال ہے تو گھروں کے اندر کا حال کیا لکھا جائے؟ ہم چاہتے ہیں کہ حکم دیں اور بچے اسے بلا چون و چرا مان لیں۔ حکم کی حکمت بیان کرنے اور بچے کے سوالات کے جواب دینے یا اصلاح کے لیے مناسب وقت اور موقع کے انتظار کے لیے جو صبر و تحمل درکار ہے، وہ ہم میں مفقود ہے۔ الا ماشاء اللہ۔

گھروں کے اندر اسلامی امور اور خاص طور پر اختلافی امور میں جبر و خوف سے آزاد فضا میں تبادلہ خیال کا ماحول نہیں بنایا جا رہا ہے۔ مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ اگلی نسلیں یا تو خوف زدہ محتاط افراد پر مشتمل ہیں یا باغیوں پر، اور ان کے درمیان کچھ ایسے نکل آتے ہیں جو لاابالی (Indifferent) ہوتے ہیں۔ بچے تو بچے ہیں، بڑوں کا حال یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی طرف براہ راست رجوع اور ان سے اپنی زندگی کے لیے ہدایات حاصل کرنے کا ان میں نہ صرف یہ کہ کوئی شوق نہیں پیدا کیا جاتا بلکہ اکثر یہ سکھایا جاتا ہے کہ ان کے بس کی بات صرف یہ ہے کہ کسی عالم کا درس قرآن یا خطبہ سن لیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنی ذاتی زندگی میں ہدایت الٰہی کی براہ راست روشنی سے محروم کر دیئے گئے اور دوسری طرف امت اپنی اجتماعی زندگی میں پیش آمدہ نئے مسائل پر غور و فکر میں ان کی فعال مشارکت سے محروم ہوگئی۔ اور یہ سب ایسے حالات میں جب کہ ہر طرح کے تجارتی لین دین، فائنانس، سماجی ربط و تعلق، سیاسی کشمکش، بین الاقوامی آویزش... میں امت کے افراد اور گروہوں کو نئے مسائل سے واسطہ ہے۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ایسے عالم اور فقیہ پائے جاتے تھے جو ذاتی طور پر تجارتی لین دین، فائنانس، سیاست اور امور صلح و جنگ کا تجربہ رکھتے تھے۔ آج کے فقیہ اور مفتی ان امور سے کوئی عملی واسطہ

نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں کہ علم دین رکھنے والے، اسلامی قانون کے ماہرین اور تجارت، فائنانس، سیاست، طب، تعمیرات... وغیرہ سے وابستہ ماہرین مل جل کر نئے پیش آمدہ مسائل کو زیر بحث لائیں مگر اس کے لیے موجودہ ماحول میں تبدیلی لانی ہوگی۔ علماء دین اور ماہرین امور دنیا میں تبادلۂ خیال اسی وقت پر معنی اور نتیجہ خیز ہوسکتا ہے جب وہ ایک دوسرے کی زبان، اصطلاحات اور ان کی باتوں کے عملی پس منظر سے مانوس ہوں اور ایک دوسرے کی قدر پہچانیں، عزت کریں۔ علماء دین جس فقہی لٹریچر کو سند مانتے ہیں اور جس کے مطالعہ پر ان کی زندگی گزرتی ہے اس کا کچھ تعارف ماہرین دنیا میں بھی ہوجائے، اور ماہرین امور دنیا، علماء دین کو اسٹاک ایکسچینج، نئے مالی دستاویزات، نئے طبی امکانات اور نئی بین الاقوامی فضا سے کچھ مانوس کرلیں تب ہی بات بن سکتی ہے۔

اجتہاد کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اجتہاد کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ آج دینی اور دنیوی امور میں لاتعداد مسائل ایسے ہیں جن پر نئی سوچ کی ضرورت ہے لیکن یہ ضرورت اس لیے نہیں پوری ہو پا رہی ہے کہ عام مسلمان اجتہاد کو ایک محدود فقہی دائرہ کی نسبت سے جانتے ہیں اور اس طرح کے اجتہادات کو وہ گنے چنے لوگوں کا کام سمجھتے ہیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر مسلمان فرد، خاص طور پر ہمارے وہ افراد جو زندگی کے نسبتاً متحرک دائروں- صنعت، مالیات، سیاست، بین الاقوامی تعلقات، طب و جراحت، تعلیم و تربیت- سے وابستہ ہوں، وہ اپنے اندر کتاب و سنت سے براہ راست روشنی حاصل کرنے کا حوصلہ پیدا کریں اور خوف و احتیاط کے وہ حجابات زائل کیے جائیں جو گزشتہ چند صدیوں میں ان کے اور قرآن و حدیث کے درمیان آ گئے ہیں۔ دوسری طرف ہر مسلمان فرد، بالخصوص علماء دین کو امور دنیا کو زیادہ قریب سے سمجھنے کی کوشش کرنی ہوگی تاکہ بالآخر اہل علم اور ماہرین فن کے باہمی تعاون سے وہ نئے اجتہادات تشکیل پاسکیں جن کا خواب دیکھنے میں سو سال ہونے کو آرہے ہیں۔

مجاہدۂ نفس

مجاہدۂ نفس، اپنے نفس کے ساتھ جہاد کا نام ہے۔ یہ اس بات کی کوشش ہے کہ نفس، مرضیات الٰہی کی تابعداری قبول کرلے۔ یہ نفسانی خواہشات پر قابو پانے اور نفس امارہ کو لگام لگانے کا نام ہے۔

مومنانہ زندگی میں رکاوٹیں صرف خارج سے ہی نہیں آتی ہیں (جن کا دور کرنے کے لیے جہاد کیا جاتا ہے) بلکہ بڑی رکاوٹ داخل سے بھی پیش آسکتی ہے جسے دور کرنے کے لیے اذکار وعبادات، احتساب نفس اور توبہ کے طریقے سکھائے گئے ہیں۔

ارشاد ربانی ہے:

وَ نَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝ (الشمس: ۷-۱۰)

''اور نفس انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا، پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کردی۔ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو خاک میں ملا چھوڑا۔''

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (یوسف: ۵۳)

''(یوسف نے کہا)... میں کچھ اپنے نفس کی برأت نہیں کر رہا ہوں، نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو۔ بے شک میرا رب بڑا غفور اور رحیم ہے۔''

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَ اَطِیْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(التغابن: ۱۶)

''لہٰذا جہاں تک تمھارے بس میں ہو، اللہ سے ڈرتے رہو؛ اور سنو اور اطاعت کرو اور اپنے مال خرچ کرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے بس وہی فلاح پانے والے ہیں۔''

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ عَلَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (المائدہ: ۳۹)

''پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کر لے تو اللہ کی نظر عنایت پھر اس پر مائل ہو جائے گی۔ اللہ بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

مجاہدۂ نفس ہر مسلمان کو کرنا ہے۔ نفس پر قابو پائے بغیر اسلامی زندگی نہیں گزاری

جاسکتی۔ لیکن جولوگ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلیں، ان کے لیے تو بہت ضروری ہے کہ ان کی نیت خالص ہو اور اعلاء کلمۃ اللہ کے علاوہ کوئی ذاتی یا دنیوی مقصد ان کے سامنے نہ ہو۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ○

(الانفال: ۴۷)

''ان لوگوں کے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کرو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں، وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔''

عن أبی موسی قال: سئل رسول اللّٰہ ﷺ عن الرجل یقاتل شجاعة، و یقاتل حمیة و یقاتل ریاء۔ أی ذالک فی سبیل اللّٰہ؟ قال رسول اللّٰہ ﷺ: من قاتل لتکون کلمة اللّٰہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللّٰہ۔

(صحیح بخاری: کتاب الإیمان، باب: ۴۱)

''ابوموسیٰ (عبداللہ بن قیس اشعریؓ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ ایک شخص اپنی بہادری کی نمائش کے لیے جنگ کرتا ہے، ایک شخص مجرد حمیت کے لیے جنگ کرتا ہے، ایک شخص محض دکھاوے کے لیے جنگ کرتا ہے۔ ان میں سے کس کی جنگ اللہ کی راہ میں ہے؟ رسول اللہ نے فرمایا: اللہ کے راستے میں اس شخص کی جنگ ہے جو اس مقصد کے لیے جنگ کرے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔''

اسی طرح اجتہاد کرنے والے کو بھی کبر نفس، غلو اور عصبیت سے پاک ہونا چاہیے، جس کے لیے مسلسل احتساب نفس ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غور وفکر کے نتائج کا انحصار بھی بڑی حد تک توفیق ایزدی اور الہام پر ہے۔ انسان کا کام صرف کوشش کرنا ہے، شرط یہ ہے کہ کوشش مخلصانہ ہو۔

وَالَّذِينَ جٰهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ○ (العنکبوت: ۶۹)

''جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انھیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقیناً اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔''

مجاہدۂ نفس کا آغاز قرآن کریم کے مطالعہ اور اس کی آیات پر غور وفکر سے ہونا چاہیے۔ علامہ ابن قیم فرماتے ہیں:

''پھر دل کی پوری یکسوئی کے ساتھ قرآن کے معانی کی طرف متوجہ ہو۔ ان کو سمجھنے کی کوشش کر، ان پر غور وفکر کر اور یہ جان لے کہ ان کا مقصود کیا ہے، وہ کس لیے نازل کیے گئے۔ اس کی ہر آیت سے اپنا حصہ جو تیرے مقدر میں ہو، حاصل کر اور ان کے ذریعہ اپنے دل کی بیماریوں کا علاج کر۔ یہ مختصر، سہل الوصول طریقہ ہے جو رفیق اعلیٰ تک پہنچانے والا طریقہ ہے، مامون طریقہ...''

(ابن قیم: مدارج السالکین، جلد: ۲، ص: ۲۸، طبع قاہرہ، ۱۹۶۵ء)

یہی احتساب نفس اور انابت الی اللہ کا صحیح طریقہ ہے:

''(بندہ) جب اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے تو جان لیتا ہے کہ اس پر کیا لازم ہے، اس سے عہدہ برآ ہو کر وہ اپنے مالک کی طرف لوٹ آتا ہے، یہی توبہ کی حقیقت ہے۔''

(ابن قیم: مدارج السالکین، جلد: ۱، صفحہ: ۱۶۹)

مجاہدۂ نفس اور اجتہاد کے باہمی ربط کا ایک دوسرا پہلو بھی اہم ہے۔ مجاہدۂ نفس، اگر صحیح علم کی رہنمائی سے محروم ہو، تو آدمی افراط وتفریط کا شکار ہو سکتا ہے، جیسا کہ پچھلی قوموں کے ساتھ ہو چکا ہے۔ ایسے ہی ایک گروہ کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے:

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ رَهْبَانِيَّةَ ۟ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ؕ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (الحدید: ۲۷)

''ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان دونوں کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔ پھر ان کی اولاد میں سے کسی نے ہدایت اختیار کی، اور بہت سے فاسق ہو گئے۔ ان کے بعد ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے اور ان سب کے بعد عیسی ابن مریم کو مبعوث کیا

اور اس کو انجیل عطا کی اور جن لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا۔ اور رہبانیت انھوں نے خود ایجاد کر لی ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا۔ (ہم نے تو ان پر) صرف اللہ کی مرضی چاہنا فرض کیا تھا۔ چناں چہ وہ رہبانیت کی پابندی کا حق نہیں ادا کر سکے اور ان میں سے جو لوگ ایمان والے تھے ان کا اجر ہم نے انھیں ادا کر دیا مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔''

دوسری صدی ہجری کے بعد اسلامی زہد و تصوف کے حلقوں میں عجمی اثرات کے نفوذ سے ایک بار پھر ایسی ہی صورت حال پیدا ہو گئی۔ اس صورت حال کا ایک تنقیدی جائزہ علامہ ابن قیم کی مذکورہ بالا کتاب ''مدارج السالکین'' میں لیا گیا ہے۔

ایک طرف یہ احتیاط لازم ہے، دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں احتساب نفس کا فقدان ہو، وہاں سے صادر ہونے والے اجتہاد پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۝ (الکہف:۲۸)

''کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے۔ اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی اور جس کا طریقہ کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔''

اسلامی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت ہیں کہ ایک ہی شخص میں جہاد، اجتہاد اور مجاہدۂ نفس۔ تینوں اوصاف جمع تھے۔ چاروں خلفاء راشدین کا نام اس سلسلے میں سرفہرست ہے۔ ائمہ اربعہ: ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد بن حنبل میں سے کسی کو دشمنان اسلام کے خلاف تلوار اٹھانے کا موقع تو نہیں ملا لیکن ان میں سے بعض کو ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا جو بہ مصداق حدیث نبوی سب سے افضل جہاد ہے:

عن أبی سعید الخدری ، قال قال رسول اللّٰہ ﷺ:
أفضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر۔

(ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الأمر بالمعروف، حدیث نمبر:۴۰۱۱)

''حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے افضل جہاد ظالم حکمران کے سامنے انصاف کی بات کہنا ہے۔''

ابوحنیفہ جیل میں بند ہوئے اور احمد بن حنبل کو کوڑے لگے۔ بعد کی تاریخ میں اس کی نمایاں مثال علامہ ابن تیمیہ ہیں جنھوں نے تاتاریوں کے خلاف جنگ کی، حکمرانِ وقت کے عتاب کے نتیجہ میں جیل میں بند رہے، ساتھ ہی وہ اجتہاد اور اسلامی تصوف کا بھی جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی خود علم جہاد نہ بلند کر سکے مگر ان کی تحریروں نے مجاہد پیدا کیے نیز اجتہاد اور تزکیہ نفس کے باب میں بہت بڑے مقام پر فائز ہوئے۔

ابوحنیفہ، احمد بن حنبل، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ جیسے جامع نمونوں سے تاریخ خالی نہیں رہی مگر عام رجحان دوسری صدی ہجری سے ان تینوں میں سے کسی ایک میں اختصاص (Specialization) کا بن گیا۔ دشمنان اسلام کے خلاف جہاد بالسیف کے مواقع رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے۔ کچھ لوگ فقہی اجتہاد کے سلسلہ میں معروف ہوئے اور اسلامی زہد وتصوف والوں کی شناخت الگ ہوگئی۔ آخر کی صدیوں تک کم وبیش یہی صورت حال رہی، یعنی کبھی کبھی تو جامع الصفات شخصیتیں ابھریں مگر عام طور پر مجاہد، مجتہد اور صوفی کی شناخت علیحدہ اور منفرد رہی۔

اٹھارویں اور انیسویں عیسوی (بارہویں، تیرہویں صدی ہجری) میں احیاء اسلام کی جو تحریکیں اٹھیں، ان کی قیادت میں بھی تینوں صفات کا اجتماع دیکھا گیا اور فی الجملہ ہر تحریک نے جہاد، اجتہاد اور مجاہدۂ نفس- تینوں کی طرف پکارا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۶۲ء-۱۶۹۹ء)، محمد بن عبد الوہاب (۱۸۰۳-۱۷۹۲ء)، محمد بن علی السنوسی (۱۸۶۰ء-۱۷۸۷ء)، امیر عبد القادر الجزائری (۱۸۸۳ء-۱۸۰۷ء) اور سید احمد شہید بریلوی (۱۸۳۱ء-۱۷۸۶ء) میں سے ہر ایک کی نظر تینوں سرگرمیوں پر تھی اور انھیں ذاتی طور پر بھی تینوں سے مناسبت رہی۔

موجودہ صورت حال

بیسویں صدی میں جب عرب ممالک میں الاخوان المسلمون، برصغیر ہند میں جماعت اسلامی اور جنوبی مشرقی ایشیا میں 'ماشومی' (مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا) نے احیاء اسلام کا علم بلند کیا تو انھوں نے بھی اصولی طور پر، تینوں سرگرمیوں پر زور دیا۔ لیکن مسلمان عوام اس بات کے عادی ہو چکے تھے کہ اجتہاد کو اپنے شاندار ماضی کا ایک باب سمجھیں، جہاد کو استعماری طاقتوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے دیکھیں اور مجاہدۂ نفس کو صوفیا اور پیر ومرشد قسم کے بزرگوں کی میراث سمجھیں۔

بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں بہت سے ایسے مسائل سامنے آئے جن میں ایسا اجتماعی اجتہاد ناگزیر ہوگیا جس پر امت بھروسہ کر سکے۔ چناں چہ مختلف ملکوں میں اس مقصد کے لیے تحقیقاتی ادارے اور مجالس فتوی قائم کی گئیں۔ مسلمان ملکوں کی تنظیم ''تنظیم اسلامی کانفرنس'' (OIC) کے تحت جدہ میں ایک اسلامی فقہ اکیڈمی قائم ہوئی جس میں اقلیتی ملکوں کے مسلمان علماء کو بھی نمائندگی حاصل ہے۔ اس اکیڈمی نے طبی اور مالی امور سے متعلق قراردادیں منظور کی ہیں اور دیگر امور زندگی سے متعلق بہت سے مسائل پر غور کرتی رہی ہے۔

اسی درمیان افغانستان میں ایسی صورت حال پیدا ہوئی کہ روسی فوج کو نکالنے کے لیے ہر ممکن قوت کا استعمال ضروری سمجھا گیا۔ اس بات کی ہمت افزائی کی گئی کہ دنیا بھر سے جذبہ جہاد سے سرشار مسلمان آکر اس جہاد میں شریک ہوں۔ پھر جہاد افغانستان میں کامیابی کے بعد بعض مجاہدین نے بوسنیا، چیچنیا، کشمیر اور فلپائن وغیرہ کا رخ کیا اور بعض کو اپنے ملک (مثلاً: الجزائر) میں جہاد کی دعوت میں جاذبیت نظر آئی۔ ایک بار جب انفرادی فتوؤں کی بنیاد پر علاقائی اسلامی مسائل کے حل کے لیے ''جہاد'' کا سلسلہ چل پڑا تو اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا اور بعض مسلم اقلیتی ممالک میں بھی اس کی طرح ڈالنے کی کوشش کی گئی۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے، اس بات کی ضرورت ہے کہ اجتماعی اجتہاد کے ذریعہ اس (Free for all) جہاد کو مقاصد شریعت کے تحت لایا جائے اور اسے جہاد کے اسلامی آداب و شرائط کا پابند بنایا جائے تاکہ یہ ایسی دہشت گردی (Terrorisim) کی شکل نہ اختیار کر سکے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف اور مسلمانوں کے مفادات کے منافی ہے۔

گزشتہ صدیوں میں مجددین اور مصلحین کی کوششوں کے باوجود عام مسلمانوں میں ایسی پیری مریدی کا سلسلہ جاری ہے جو حقیقی اسلام کی سند سے محروم ہے۔ مجاہدۂ نفس میں اختصاص کے مدعی آسانی سے کم علم مگر خوش عقیدہ مسلمان عوام کے دلوں میں جگہ بنا لیتے ہیں۔ نتیجہ میں عوامی سطح پر اسلام اپنی حرکیت (Dynamism) کھو بیٹھا ہے اور عالمی سطح پر اس کی تصویر بگڑی ہے۔

اسلام کے عالمی مشن کی تکمیل میں، جس کا مستند ذریعہ دعوت اور شہادت حق ہے، جہاد، اجتہاد اور مجاہدۂ نفس کے سیاق میں ہونے والی افراط و تفریط بڑی رکاوٹ ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک بار پھر تینوں کے ربط باہم کی بحالی عمل میں لائی جائے تاکہ مسلمان اپنے عمل اور فکر- دونوں کے ذریعہ انسانوں کے سامنے اسلام کی صحیح ترجمانی کر سکیں۔

حوالے

ابن قیم: مدارج السالکین، قاهره، مطبعه السنة المحمدیه، ۱۹۵۶ء

ابن ماجه: سنن، تحقیق محمد فؤاد عبد الباقی، قاهره، دار إحیاء الکتب العربیه، ۱۳۲۹ھ

أبو داؤد: سنن، تحقیق محمد محی الدین حمید، بیروت، دار الفکر، تاریخ طبع نہیں۔

بخاری: الجامع الصحیح

ابوالاعلیٰ مودودیؒ: الجہاد فی الاسلام، دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ۱۹۹۵ء

ابوالاعلیٰ مودودیؒ: تجدید واحیاء دین، رامپور، مکتبہ جماعت اسلامی ہند، تاریخ درج نہیں۔

امین احسن اصلاحی: تزکیہ نفس، دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ۱۹۹۹ء

الدارمی: سنن، القاهره، دار الفکر، ۱۹۷۸ء

سید جلال الدین عمری: (۱) ''جہاد اور اس کی اقسام'' (۲) ''جہاد اور شرائط جہاد'' (۳) جہاد کے بعض احکام جہاد'' تحقیقات اسلامی (علی گڑھ) میں بالترتیب اکتوبر- دسمبر ۲۰۰۱ء، جنوری- مارچ ۲۰۰۲ء اور اکتوبر- دسمبر ۲۰۰۲ء کے شماروں میں شائع ہوئے (جلد:۲۰، شمارہ:۴؛ جلد:۲۱، شمارہ:۱ اور جلد:۲۱، شمارہ:۴)

سید قطب: فی ظلال القرآن، قاهره، طبع خامس، ۱۹۶۶ء

علامہ محمد اقبال:
Reconstruction of Religion Thought in Islam, Lahore, Shcikh Muhammad Ashraf. 1968

عصام العریان: "الجهاد حر باهل یصح کفرض فی الحرب علی العراق"، روز نامہ الحیات، لندن، اپریل، ۲۰۰۲ء۔

مذہبی روایات کے جوہر کو سمجھنے کی ضرورت اور اہمیت ☆

انسانی آبادی جب سے شروع ہوئی لوگوں کو مل جل کر رہنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ماحول سے نبٹنا اور خود اپنے وجود کے بارے میں کیوں، کہاں سے اور کدھر کو جیسے بنیادی سوالات سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ ساتھ مل جل کر رہنے کا یہ چیلنج کوئی معمولی چیلنج نہیں تھا۔ ایسے میں مذہب نے انسان کی دستگیری کی اور اسے ان تینوں چیلنجوں سے نبٹنا سکھایا۔ اس نے بتایا کہ سارے انسان ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ اس نے انسان کا رشتہ خدا سے استوار کر کے اطمینان دلایا کی ماحول بھی اُسی خدا کا تابع ہے جو انسانوں کا آقا ہے۔ اس طرح مذہب نے ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کر کے انسانوں کو تصادم، اعصابی تناؤ اور توحش سے بچایا۔

یہ کل کی بات تھی، دیکھنا یہ ہے کہ آج کے امکانات کیا ہیں۔ فی الفور ترسیل و ابلاغ اور خبروں کے تیز رفتار پھیلاؤ، فاصلوں کا سمٹنا اور رکاوٹوں کا دور ہونا... ان سب نے مل کر پوری دنیا کو ایک آبادی بنا دیا ہے۔ ثقافتی اختلاط، بدلتے لباس اور کھانے پینے میں ایک دوسرے کے پکوانوں سے استفادہ عام چلن بن چکا ہے۔ پہلے کی طرح اب اپنے ہم مذہبوں اور اپنے ہی نسلی گروہ کے ساتھ رہنے کو ضروری نہیں سمجھا جاتا بلکہ ملی جلی آبادیوں کا رواج ہے جن میں رہنے والوں کی زبان، رنگ، نسل اور مذہب جدا جدا ہوتے ہیں۔

انسانوں کو اب کچھ نئے مسائل کا سامنا ہے۔ بازار کی بڑھتی ہوئی وسعتوں نے نئے مواقع تو بے شک پیدا کیے مگر سب کے لیے نہیں۔ جہاں مواقع بڑھے وہاں عدم تیقن اور خطر کی نئی نئی قسمیں بھی نمودار ہوئیں۔ طاقت ور کے ہاتھوں میں نئے نئے ہتھیار ہیں تو کمزوروں نے

☆ یہ مقالہ ۹ اپریل ۲۰۰۵ کو دہلی میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ایک بین الاقوامی سیمنار میں انگریزی میں پیش کیا گیا تھا۔ سیمنار کا موضوع تھا: گلوبلائزیشن کی دنیا میں تہذیبوں کے مابین مکالمہ۔ مقالہ کو اردو کا جامہ پہنانے میں ڈاکٹر سید عبد الباری صاحب نے مدد کی ہے جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

نئے حلیف تلاش کر لیے ہیں۔ تشنج پیدا ہو رہا ہے، یاس وقنوط نے گھیر رکھا ہے اور ٹکراؤ بڑھ رہا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ یہ نظام خود اپنی خرابیوں کی اصلاح سے قاصر ہے۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ قومی حکومتیں اور بین الاقوامی ادارے صورت حال کو بہتر بنا سکیں گے مگر عملاً حکومتیں اور ادارے خود مسئلہ بن گئے ہیں۔ توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت آج سے زیادہ کبھی نہیں تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا مذہبی اقدار اور روایات کی طرف رجوع سے کچھ مدد مل سکتی ہے؟ کیا مذہب ایک بار پھر وہی ایجابی کردار ادا کر سکتا ہے جو اُس نے انسانی سماج کے ابتدائی دور میں کیا تھا؟

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ان کے نزدیک مذہب ایک تقسیم کرنے والی چیز ہے نہ کہ ملانے والی۔ مذہب انسانی گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر دیتا ہے۔ وہ انسانی عقل کو معطّل کر کے قوت استدلال کو ماؤوف کر دیتا ہے۔ مذہب عام انسانوں کو چند لوگوں کا تابع دار بنا دیتا ہے جو ہدایت الٰہی کے امین ہونے کا اور اس کی بنیاد پر انسانوں کی رہنمائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہر مذہب کو اپنی سچائی پر ایسا یقین ہوتا ہے کہ وہ غیر مذہب کے ساتھ کوئی رواداری نہیں برت سکتا۔ نتیجہ میں مذاہب کی پیروی کرنے والوں میں تعصب اور کٹّر پن عام ہے۔ ان لوگوں کے خیال میں مذہب اپنی فطرت کے اعتبار سے سرپرستانہ اور تحکّمانہ مزاج رکھتا ہے۔ وہ انسان سے تخلیقی قوت، ایجاد و اختراع اور تجربہ کرنے کی صلاحیت چھین لیتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر مذہب نے اپنا تسلّط جمانے کی کوشش کی ہے۔ امپریلزم اور نوآبادیاتی مہم جوئی میں مذہب آلۂ کار بنتا رہا ہے۔ کتنی ہی جنگیں ہیں جن میں مذہب کے نام پر معصوم انسانوں کا خون بہایا گیا ہے۔

مذاہب کے نمائندے ان الزامات سے برأت کا اعلان کرتے نہیں تھکتے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ماضی کی لغزشوں کو مستقبل کے امکانات کی راہ میں روڑا نہیں بننے دینا چاہیے۔ وہ مذہبی روایات کے جوہر کو مرکز توجہ بنانے کی دعوت دیتے ہیں اور ان تفصیلات سے درگزر کرنے کو کہتے ہیں جو زمان و مکان کے اثرات سے سامنے آئی تھیں۔ اہل دانش اس بات پر دھیان دے رہے ہیں، اور انھیں ایسا ہی کرنا چاہیے کیوں کہ جدید فکری نظام اپنی غلطیوں کی اصلاح اور کمیوں کی تلافی سے قاصر رہا ہے۔ سیکولر روایات میں حرص دنیا کم کرنے، تسلّط پسندی کو لگام لگانے اور استحصال کی جگہ دولت اور آمدنی کی تقسیم میں عدل و احسان کو رواج دینے کی کوئی صلاحیت نہیں۔

مادّیت عدل وانصاف کے لیے کوئی عالم گیر اور دائمی بنیاد نہیں فراہم کرسکتی۔ اور ظاہر ہے کہ عدل کے بغیر دیرپا امن کا قیام ممکن نہیں۔ عملیت پسندی کا فلسفہ (Pragmatism) ہمیشہ طاقت ور اور غالب اقوام کا آلۂ کار بن کر غریبوں اور کمزوروں کے استحصال کا جواز فراہم کرتا رہا ہے۔

اسلام کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ معاصر انسانیت کی اس ضرورت کو اسلام کس طرح پوری کرتا ہے۔ درحقیقت اس بارے میں اسلام کا موقف دیگر مذہبی روایات کے موقف سے بہت مختلف نہیں ہے۔ چناں چہ ایک مشترکہ پلیٹ فارم بن سکتا ہے۔ مختلف مذاہب کے پیرو ایک ایسا ایجنڈا مرتب کرسکتے ہیں جو انسانیت کو بربادی کی طرف بڑھنے سے روکے۔ اس ایجنڈا کو وہ لوگ بھی قبول کرسکتے ہیں جو انسانیت کے بہی خواہ ہیں مگر مذہب سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے۔ تصادم اور باہمی آویزش سے پاک، ہر ایک کے لیے جگہ رکھنے والا یہ پلیٹ فارم نہ صرف تہذیبوں کے درمیان گفت وشنید کے لیے مناسب نقطۂ ارتکاز بن سکتا ہے بلکہ یہ امن اور خوش حالی کے ایک نئے عہد کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوسکتا ہے جو دنیا کو ظلم وزیادتی اور طرح طرح کی محرومیوں سے نجات دلا سکے۔ ایک ایسے ایجنڈا کی ترتیب اور مشترکہ پلیٹ فارم کی تشکیل کا نقطہ آغاز یہ ہونا چاہیے کہ مذہبی روایات کے جوہر کو ازسرنو سمجھا جائے۔ اہم سوال یہ ہے کہ یہ کام کون کرے۔

اسلام

اسلام میں انسان اور خدا کے مابین رشتہ تمام دوسرے رشتوں کی بنیاد بنتا ہے۔ ایک انسان اور دوسرے انسان، نیز انسان اور خارجی ماحول کے درمیان تعلق اسی رشتے پر مبنی ہونا چاہیے۔ چوں کہ اسلام میں انسان اور خدا کے مابین بندگی کا رشتہ ہر طرح کے دباؤ اور جبر سے پاک آزادانہ انتخاب پر قائم ہوتا ہے اس لیے آزادی اور عدم اکراہ کو اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انسانوں کے درمیان اخوت اور بھائی چارہ کی بنیاد بھی ان کا یہی احساس ہے کہ ان سب کا خدا ایک ہے، یہی بات انھیں ایک دوسرے کا احترام کرنا سکھاتی ہے اور ان میں یہ آمادگی پیدا کرتی ہے کہ سب کے حقوق ادا کریں۔ ماحول (Environment) اب ذمہ دار اور جواب دہ انسانوں کو خدا کی دی ہوئی نعمت بن کر سامنے آتا ہے جسے انسان کو کارحیات میں اپنا شریک اور

مددگار سمجھنا چاہیے۔ نظریاتی سطح پر ہم آہنگی اور مطابقت کے باوجود اگر انسانوں کے مابین نزاع پیدا ہو تو اس کے دور کرنے کا موزوں طریقہ باہمی مشاورت اور فیصلہ میں سب کی شرکت کا طریقہ ہی ہوسکتا ہے۔

اسلام کے نزدیک امن کے لیے ضروری ہے کہ ظلم نہ ہو اور امن کی مستحکم بنیاد ایمان ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَ ھُمْ مُّھْتَدُوْنَ○ (الانعام:۸۲)

''حقیقت میں تو امن انہی کے لیے ہے اور راہ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔''

ظلم کی تعریف ہے: وضع الشیء فی غیر محلّہ یعنی کسی چیز کو وہ درجہ دینا جو مناسب نہ ہو۔ ظلم کا ترجمہ سیاق کی مناسبت سے زور زیادتی اور ستم رانی بھی کیا جاسکتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت:۷۰ وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ... (ہم نے بنی آدم کو عزّت دی ہے...) کی روشنی میں یہ بھی ظلم ہوگا کہ کسی آدمی کو حقیر و ذلیل سمجھا جائے۔ کیوں کہ قرآن کی اس آیت کی روشنی میں عزّت کے لیے آدمی ہونا کافی ہے اب اس اصول کو اس حقیقت سے جوڑیے کہ دنیا کی یہ زندگی امتحان کے لیے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط (ملک:۲)

جس نے بنائی موت اور زندگی تاکہ تمہارا امتحان لے کون تم میں اچھا کام کرتا ہے...

نیز یہ اصول سامنے رکھیے کہ ''دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے...''

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ ج (البقرہ:۲۵۶)

تو مسلمان اور غیر مسلمان انسانوں کے درمیان رشتہ بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ ہر انسان کو حق ہے کہ وہ آزادانہ طور پر یہ طے کرے کہ اس کا دین کیا ہوگا۔ اس کے انسانی عزّ و شرف پر اس کے انتخاب کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ میری نظر میں کسی کا انتخاب غلط بھی ہو تو میری نظر میں اس کے احترام میں کمی نہیں ہوگی۔ ہر مذہب کے ماننے والے، اور وہ لوگ بھی جو کسی مذہب کو نہ مانتے

ہوں، اور وہ لوگ جو مسلمان ہوں سب انسان ہونے کے ناتے برابر کے باعزّت ہیں۔

ایک فرد کا یہ حق کہ وہ آزادانہ انتخاب کرے دوسرے فرد کو اُس سے اختلاف کا حق بھی دیتا ہے، یہ بات کہ میں حق پر ہوں یہ معنی رکھتی ہے کہ کوئی دوسرا ناحق پر ہوسکتا ہے۔ میرے نزدیک جو ناحق پر ہے مگر خود کو حق پر سمجھتا ہے اسے بھی یہ حق حاصل ہے کہ مجھے ناحق پر سمجھے۔ آپس میں اچھے تعلقات کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک کو حق پر سمجھا جائے۔ اس خیال پر شرمانے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی اس کو کٹر پنتھی شمار کرنا چاہیے نہ اس سے لازماً تعصّب اور شدت پسندی جنم لیتی ہے۔ سماج کو برباد کرنے والی بات تو یہ ہے کہ کچھ لوگ دوسروں کے آقا بن کر ان پر اپنی رائے تھوپنا چاہیں اور ان کو ان کے فطری حق انتخاب سے محروم کردیں یا انھیں ایک ایسا طرز زندگی (دین) اختیار کرنے پر مجبور کردیں جس کو انھوں نے خود نہ منتخب کیا ہو۔ اسلام اس طریقہ کو رد کرتا ہے اور میرے خیال میں سارے قابل ذکر مذاہب زور زبردستی کو رد کرتے ہیں۔ چناں چہ ہم جس مشترکہ ایجنڈا کی بات کر رہے ہیں اس کی پہلی دفعہ یہ ہونی چاہیے: انسانی عزّ وشرف کے ساتھ آزادئ انتخاب۔

مشترکہ ایجنڈا

آزادئ انتخاب کے بعد ہمارے مشترکہ ایجنڈا میں جن اصولوں کو جگہ ملنی چاہیے وہ ہیں سماجی مساوات، جمہوری طریقۂ فیصلہ اور معاشی زندگی میں عدل و احسان کی فرمانروائی۔ ہم مسلمان ان میں سے ہر اصول کے حق میں قرآن وسنت سے دلائل فراہم کرسکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جن عالمی مذاہب کے نمائندے یہاں موجود ہیں وہ بھی اپنے مآخذ سے ان قدروں کی تائید وتاکید فراہم کرسکیں گے۔ اہم تر بات یہ ہے کہ آج گلوبلائزیشن کے نتیجہ میں دنیا کے ہر گوشہ میں انسان انھی اصولوں کی کارفرمائی چاہتے ہیں مگر اس قبول عام اور طلب کے باوجود انسانوں کی عظیم اکثریت ان قدروں کی حکمرانی سے محروم ہے۔ ستم یہ کہ آزادئ انتخاب، سماجی مساوات، جمہوری طریقہ فیصلہ اور معاشی عدل سے محروم انسانوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اپنے کو مذاہب کے پیرو بتاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو چیز سب چاہتے ہوں وہ عملی طور پر کیوں نہیں پائی

جاتی۔ کیا اس کی ساری ذمہ داری غیروں پر ڈالنی بجا ہے؟ کیا اس صورت حال کی تمام تر ذمہ داری سابق نوآبادیاتی حکمرانوں یا موجودہ واحد سپر پاور پر ڈالی جاسکتی ہے؟ ایسا تو نہیں کہ غلط رسم ورواج اور صدیوں کے انحراف کے نتیجہ میں آج مذہب جس شکل میں پایا جاتا ہے وہ ان قدروں کو پروان چڑھانے سے قاصر ہو؟ اگر انسانیت کی رائے عامہ ان قدروں کو عزیز رکھتی ہے تو غیروں کی آقائی اُن آقاؤں کے اِن اصولوں کو پامال کرنے کے باوجود اتنے عرصہ تک کیسے چلتی رہی؟ مذہبی روایات کے حامل لوگ مذہب کی حقیقی روایات سے انحراف اور رسم رواج کے نام پر ان کی فراموشی کو کیوں نہیں دور کرسکے؟ ان باتوں کا تجزیہ کیا جانا چاہیے اور اس تجزیہ کی روشنی میں احتساب اور نقد ذاتی کا ایک ایسا عمل شروع ہونا چاہیے جو جوش سے زیادہ ہوش پر مبنی ہو۔ اور گرما گرمی کے بجائے روشنی پیدا کرے۔

بنیادی قدروں کا کوئی نظام روحانی بنیادوں کے بغیر نہیں چل سکتا۔ جب نسل پرست فاشسٹ طاقتیں یلغار کرتی ہیں تو عقلیت اور افادیت پر مبنی ہر ایجنڈا پسپا ہوجاتا ہے۔ ہمہ گیر اور آفاقی اخلاقیات کی بنیاد صرف ایک عادل خدا پر ایمان بن سکتا ہے، جو رنگ ونسل، مذہب وملّت اور ذات پات وغیرہ تقسیموں کو خاطر میں نہ لاتا ہو۔ آزادی، مساوات، جمہوری طریقۂ فیصلہ اور معاشی عدل کو صرف نعروں کے زور پر یا افادیت کی بنیاد پر نہیں قائم کیا جاسکتا۔ خارج میں ان کے نفاذ سے پہلے ضروری ہوگا کہ افراد کا اندرون ان قدروں کو اپنا لے۔ افراد انسانی کے داخل میں آزادی، ایک دوسرے کا احترام، فیصلوں میں سب کی شرکت اور معاشی عدل واحسان کی قدریں راسخ ہوں تب ہی ان قدروں پر مبنی سماجی ادارے اور قوانین کامیابی کے ساتھ مطلوبہ نتائج سامنے لاسکتے ہیں۔ مگر جب کسی فرد یا گروہ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کردیا جائے کہ اس کا مفاد دوسروں کی آزادی سلب کیے بغیر یا ان کے استحصال کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا تو وہ دوہرے معیار اختیار کرلیتے ہیں۔ ان کا اندرون ان فطری اصولوں سے دور ہوجاتا ہے جن میں ساری انسانیت کی بھلائی ہے۔ مگر یہ ''غلط فہمی'' دور کی جاسکتی ہے اور اس مہم میں ہمیں ان لوگوں کا تعاون بھی حاصل ہوسکتا ہے جو بظاہر دوہرے معیار اختیار کرکے فائدے میں ہیں۔

میں اس خوش فہمی میں نہیں مبتلا ہوں کہ حق واضح کردینا اور غلط فہمیوں کا ازالہ کردینا

سامراج کے خاتمہ کے لیے کافی ہوگا یا یہ کہ موجودہ غیر عادلانہ نظام کی جگہ دولت اور آمدنی کی تقسیم کا ایک ایسا نظام جو عدل و احسان پر مبنی ہو صرف وعظ و تلقین کے ذریعہ قائم ہو جائے گا۔ کشمکش اور آویزش کے بغیر کوئی بنیادی تبدیلی آنا دشوار ہے۔ مگر اس عملی جدّوجہد میں کامیابی کے لیے ایک واضح اخلاقی موقف درکار ہے جس کی اپیل ہمہ گیر اور آفاقی ہو۔ جس کے ساتھ رسم و رواج پر مبنی قدیم روایات کا کوئی بوجھ نہ لادا جائے۔

چیلنج کا جواب

یہ ہے وہ چیلنج جس کا ہم اہل مذاہب کو سامنا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم دوسروں پر الزام لگا کر اپنی ذمہ داریوں سے دست کشی اور اپنے خلاف کی جانے والی سازشوں کا حوالہ دے کر مظلومیت کے خول میں پناہ لینے کی بجائے معاصر انسانیت سے مذکورہ بالا قدروں کی بنیاد پر ہم کلام ہوسکیں؟ کیا ہم دنیا کے مردوں اور عورتوں کو ان قدروں کے ذریعہ ایک بار پھر ان قدروں کے سرچشمہ یعنی ان کے پروردگار سے جوڑ سکیں گے؟ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اس کو انجام دینے کے لیے اپنی انانیت کو بھول کر انکسار اور ایثار و تواضع کی جو روش اختیار کرنی ہے وہ ہم اہل مذاہب کے اندر کم پائی جاتی ہے۔ کامیابی کے لیے خودی کو مٹا کر کسر نفسی کی راہ اختیار کرنے اور افراد انسانی کو اپنے مالک سے تعلق اختیار کرنے کی دعوت دینا ضروری ہے۔ ان پر جتلانا ہوگا کہ آج بنی نوع انسان کی بقا خطرہ میں ہے۔ ہم سب کو تنگ نظری اور وقتی مصالح کو نظر انداز کرتے ہوئے آفاقی اور جاوداں مفادات پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ اس کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ انسانوں کو از کار رفتہ تعبیروں اور ان ثانوی مآخذ کا پابند بنایا جائے جو اپنی معنویت کھو چکے ہیں۔ اس کی بجائے ان کو اصل کی طرف رجوع اس پر غور و فکر، تبادلۂ خیالات اور تجربہ کا وقت دینا چاہیے۔

کیا ہم ایسا کرسکیں گے؟ کیا ایسا کرنا ضروری ہے؟ جی ہاں، ہمیں ایسا کرنا ہی ہوگا۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ جو توانائی انسان کو براہ راست خدا سے روحانی تعلق، اس کی عبادت اور اس کے پیغام سے استفادہ کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے اس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ یہ توانائی ان رہنماؤں اور مرشدین کی پیروی سے نہیں حاصل ہوسکتی جو خود مقام الوہیت سے اتنا ہی دور ہیں

جتنا ہم، اور خود ہماری ہی طرح کے انسان ہیں۔ سیکولر مادیت پر مبنی گلوبلائزیشن کے سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لیے اہل مذاہب کو روحانی طاقت اور اخلاقی تیقن کے اس اونچے سے اونچے معیار تک پہنچنا ضروری ہے جو ممکن ہو۔ یہ توانائی ہمیں اس لیے درکار ہے کہ ہم ایک نئے عالمی نظام کی تشکیل کر سکیں جو روحانیت، اخلاق، حرّیت، مساوات، جمہوری طریقۂ فیصلہ اور عدل و احسان پر مبنی معیشت پر قائم ہو۔ ایسا یقین اور ایسی طاقت خدائی پیغام سے براہ راست متاثر ہونے والوں کو حاصل ہوتی رہی ہے۔ پروردگار سے لو لگانے سے جو بے نفسی اور خلوص پیدا ہوتا ہے وہ ان لوگوں کو نہیں نصیب ہوتا جو اپنے اور خدا کے درمیان اپنے ہی جیسے واسطوں کا سہارا لیتے ہیں۔ جن لوگوں کا سر عاجزی کے ساتھ ہر آن ہر جگہ موجود خدا کے حضور نہ جھکا رہے ان میں وہ بے لوث جذبۂ خدمت نہیں پیدا ہوتا جو نئے عالمی نظام کی تشکیل کے اہم کام کو غرور نفس اور عصبیتوں کا شکار ہونے سے بچا سکے۔

دوسرا سبب جس کی بنا پر ہر مرد اور عورت کو ہدایت کے سرچشمہ سے براہ راست فیض یاب ہونے پر اکسانا ضروری ہے موجودہ حالات کا انوکھا پن ہے۔ انسانی تاریخ کو آج جیسے حالات سے کبھی سابقہ نہیں پڑا آج انسانی ذکاوت و ذہانت کو پابہ زنجیر کیے بغیر آزادانہ عمل کا موقع ملنا چاہیے۔ مقدس صحیفوں کا شرح و حاشیہ کے بغیر مطالعہ ضروری ہے کیوں کہ یہ شرحیں اور حاشیے جن حالات کے لیے لکھے گئے تھے وہ بدل گئے۔ موجودہ تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انسان کے پاس دو ہی ذرائع ہیں۔ انسانی عقل و تجربہ، وجدان و بصیرت وغیرہ اور خدا کا کلام۔ وہ مذہبی رہنما جو عام انسانوں کو ان دونوں ذرائع سے یہ کہہ کر محروم کرنا چاہتے ہیں کہ کلام الٰہی کو صرف وہ سمجھ سکتے ہیں اور بدلے ہوئے حالات میں نئی راہ عمل صرف وہ تجویز کر سکتے ہیں بہت بڑے گناہ کے مرتکب ہیں۔ انھیں ایسا کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ نہ تو خدا نے انھیں اپنا ترجمان مقرر کیا ہے نہ وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے زیادہ عقل مند اور باصلاحیت ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟

دراصل یہ لوگ ڈرتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ عام لوگ مقدس کتابوں سے خود ہدایت

حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تو ان سے غلطیاں ہوں گی۔ نت نئے مسائل پر غور کرنے والے مرد اور عورتیں ان مسائل کے مختلف حل پیش کریں گی۔ اس طرح فکری انتشار پھیلے گا۔ اندیشہ ہے کہ سماج عملی طور پر بھی افراتفری کا شکار ہو جائے۔ انارکی ہر حال میں بری ہے مگر مذہب کے نام پر انارکی کسی طرح قابل قبول نہیں۔ اس کے نتیجہ میں تو مذہب پر سے عوام کا اعتماد ہی جاتا رہے گا۔

انارکی اور افراتفری کا یہ اندیشہ مبالغہ پر مبنی ہے، انسانی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ مزید برآں انارکی سے بچنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا گیا ہے اس سے صورت حال بہتر ہونے کا کوئی امکان نہیں نظر آتا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب خدا نے خود انسانوں کو اپنا کلام پڑھنے اور سمجھنے کی دعوت دی ہے[1] تو ہم کون ہوتے ہیں جو اس راستہ کو بند کر دیں؟ خدا اپنے بندوں کی صلاحیتوں سے زیادہ واقف ہے۔ ہمیں لوگوں کی سمجھ پر بھروسہ کرنا چاہیے اور ان کے اور آسمانی صحیفوں کے درمیان روک نہیں بننا چاہیے۔ نئے مسائل کے حل تلاش کرنے میں بھی ہمیں عام انسانوں کی ہمت شکنی نہیں کرنی چاہیے۔ جدید حالات میں مذہبی روایات کے فہم کا کام بھی خواص تک محدود نہیں رہنا چاہیے کیوں کہ یہ فہم تازہ اسی صورت میں جڑ پکڑے گا اور عوامی زندگی پر اثر انداز ہوگا جب وہ عوامی سطح سے ابھرے۔

توقع کی جاتی ہے کہ آج کے مرد اور عورتیں جب ہدایت الٰہی کی طرف رجوع کریں گے تو وہ سارے ذرائع استعمال کریں گے جو انھیں حاصل ہیں۔ غور و فکر، تبادلہ خیالات، مشاہدہ و تجربہ، تجزیہ وغیرہ کے وسیع اور طویل المیعاد عمل میں عوام حسب ضرورت اپنے مذہبی پیشواؤں سے بھی مدد لیں گے۔ البتہ یہ درست نہیں ہوگا کہ بحث و نظر کے اس عمل پر مذہبی پیشوا اس طرح مسلّط رہیں کہ عوام آزادئ فکر سے محروم ہو جائیں۔ مذہبی رہنماؤں کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مطالعہ و تحقیق کا یہ عوامی عمل اپنے اصل ہدف کو نہ بھولے، یعنی ایک ایسے عالمی نظام کی تلاش جو اخلاق، حریت، مساوات، جمہوری طریقۂ فیصلہ اور عدل و احسان پر مبنی ہو۔

---

(۱) قرآن کریم کی متعدد آیات ہر انسان کو اللہ کا کلام سننے، پڑھنے، سمجھنے، اس پر باہم تبادلہ خیال کرنے اور سیر و سیاحت اور مشاہدہ کے ذریعہ اس کی تصدیق پر آمادہ کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

سورہ نمبر ۹۸: آیت نمبر ۱؛ ۳۴: ۶؛ ۱۶: ۴۴؛ ۲۲: ۴۶؛ ۶: ۹۸؛ ۷: ۱۸۵؛ ۱۲: ۱۰۹؛ ۲۸: ۷۲؛ ۳۵: ۹ اور ۲: ۱۲۱

اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ کوئی مذہبی گروہ اصل کام کے سلسلہ میں قابل ذکر پیش رفت نہیں کر سکا۔ کوئی مذہبی حلقہ سیکولر مادیت پر مبنی تسلط پسند گلوبلائزیشن کے خلاف کوئی عوامی تحریک نہیں شروع کر سکا۔ اس بات کا امکان کم ہے کہ کوئی ایک مذہبی گروہ مستقبل میں ایسا کرنے میں کامیاب ہو سکے کیوں کہ غالب امکان یہی ہے کہ اُس کی اپیل اپنے ہم مذہبوں تک محدود رہے گی۔ ضرورت آفاقی پیمانہ پر روحانیت پر مبنی نظام تشکیل دینے کی ہے جو تمام مذہبی روایات کو سمو لے اور ہر مذہبی روایت کو اپنا کردار ادا کرنے کا مساوی موقع دے۔ اس کا طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم عوامی سطح پر، عقل وخرد کی روشنی میں، انسان کی جملہ مذہبی روایات کے ان عناصر کی طرف رجوع کریں جن میں الٰہی مآخذ پر مبنی ہونے کی پہچان پائی جاتی ہو۔ اگر ہم اس طرح الٰہی ہدایات کی طرف رجوع اور ان سے فیض یابی کی عوامی تحریک چلا سکے تو امید ہے کہ اپنے مقصد تک پہنچ سکیں گے۔